قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات

اور

ان کے بارے میں علماءِ کرام کے خدشات

ڈاکٹر اسرار احمد

تنظیم اسلامی
مرکزی دفتر: A-67 علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
فون: 36366638, 36293939 فیکس 36271241
www.tanzeem.org

قرآن کے نام پر اُٹھنے والی تحریکات

اور

اُن کے بارے میں علماءِ کرام کے خدشات

ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ

بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ تعالیٰ نے یہ خطاب رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ کے جمعۃ الوداع کے موقع پر مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں فرمایا تھا۔ شیخ جمیل الرحمٰن صاحب مرحوم نے اسے ٹیپ سے اتار کر مرتب فرمایا اور یہ میثاق ستمبر ۱۹۸۴ء میں شائع کیا گیا۔ بعدازاں محترم ڈاکٹر صاحب کی تالیف ''جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی'' کا جزو بنا دیا گیا۔ موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر یہ فکر انگیز خطاب مزید نوک پلک درست کر کے تیئیس سال بعد میثاق میں دوبارہ شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اعوذ باللہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۬ۙ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾﴾ (یونس)

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَا ذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا ۙ وَّ یَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ (البقرۃ)

﴿وَ اعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوۡا ......﴾ (آل عمران:۱۰۳)

گزشتہ خطابات کا خلاصہ

پچھلے دو جمعوں سے میری گفتگو جس موضوع پر چل رہی ہے اس کا جامع عنوان ہے: ''جہاد بالقرآن''[1]۔ اس ضمن میں پہلے جمعہ میں تمہیدی طور پر اُن نکات کو ایک نئی ترتیب سے پیش کیا گیا تھا جو بارہا میں آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا آلۂ انقلاب قرآن حکیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کو اگر دو مرحلوں میں تقسیم کریں تو ایک مکی دَور ہے اور دوسرا مدنی دَور ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مدنی دَور میں نمایاں ترین چیز تلوار ہے جبکہ مکی دَور کی نمایاں ترین چیز قرآن مجید ہے۔ قرآن وہ معنوی تلوار ہے جس نے نظریاتی اور اعتقادی سطح پر شرک' کفر' الحاد اور زندقہ کا قلع قمع کیا۔ مدنی دَور کی تلوار حقیقی تلوار ہے' جس نے مشرکین و کفار کے ساتھ نبرد آزمائی کی۔ اصل میں یہ دو تلواریں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے سپرد فرمائی تھیں' بفحوائے آیتِ سورۃ الحدید: ﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡکِتٰبَ وَالۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡهِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ......﴾ (آیت ۲۵) ''ہم نے بھیجا ہے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں' اور اتارا ہم نے لوہا جس میں سخت لڑائی (کی صلاحیت) ہے''۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تحت الشعور میں ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ ہے اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار نظر آتی ہے۔ یہ تصور ہمیشہ سے ہمارے اجتماعی شعور میں موجود ہے۔

اسی طرح جب میں نے نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ' آپ ؐ کی بائیس تیئیس سالہ جدوجہد اور آپ ؐ کے انقلابی عمل پر غور کیا تو یہی دو اہم مراحل میرے سامنے آئے۔ آنحضور ﷺ نے آغازِ وحی کے بعد تن تنہا توحید کے انقلابی نظریہ کی تبلیغ و دعوت کا آغاز فرمایا۔ اس کا اصلی آلہ قرآن مجید تھا۔ آپ ؐ کی تمام مساعی کا محور و مدار قرآن مجید ہی

تھا۔ جو سعید روحیں آپ ؐ پر ایمان لائیں آپ ؐ نے ان کی تربیت و تزکیہ فرمایا' ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی' انہیں منظّم فرمایا اور اس طرح متقی افراد کی ایک جماعت تیار فرمائی۔ ان اصحاب کے قلوب میں ایمان و یقین اس طور سے پیوست اور نقش ہو گیا تھا کہ جس کی بدولت ان کے اندر دین توحید کے لیے تن من دھن قربان کرنے کا جذبہ' اس راہ میں پیش آنے والے مصائب و شدائد کو برداشت کرنے کا عزم و حوصلہ' راہِ حق میں جامِ شہادت نوش کرنے کا ذوق و شوق' یہاں تک کہ اگر اللہ کے دین کے لیے گھر بار' بیوی بچے' اعزہ و اقارب کو چھوڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی ہمہ تن آمادگی پیدا ہو گئی تھی۔ الغرض ایثار و قربانی کے وہ عزائم جو کسی بھی انقلابی تحریک کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں' ان میں اپنے نقطۂ عروج و کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ اس جماعت کے ہر فرد کے لیے اپنے ہادی و رہنما ﷺ کا اشارہ بھی حکم کے درجہ میں تھا کہ جو بات آپ ؐ نے فرما دی اس پر سرِ تسلیم خم ہے۔ نورٌ علیٰ نور یہ کہ ایسا رویہ اور طرزِ عمل صرف رضائے الٰہی کی خاطر پیشِ نظر تھا۔ جدید اصطلاح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایسے فدائین اور جاں نثاروں کی جماعت تھی جو مکمل طور پر committed افراد پر مشتمل تھی۔ اس میں سمع و طاعت کا نظام بکمال و تمام موجود تھا۔ اس جماعت کے ہر فرد کا تزکیۂ نفس اس کمال تک ہو گیا تھا کہ نفسِ انسانی کے رذیل تقاضوں' شہوات و لذات کے ناشائستہ داعیات' دل کے امراض اور اخلاقی ذمائم پر قابو پا کر انہوں نے اپنے قلوب و نفوس کو پاک کر لیا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کے اوصاف کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ان کی مدح فرمائی ہے۔

اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ اس جماعت نے جدوجہد کی' قربانیاں دیں' کفر کی طاقت سے پنجہ آزمائی کی' مقاتلہ کیا' فَیَقۡتُلُوۡنَ وَیُقۡتَلُوۡنَ کے مصداق انہوں نے کفار کو قتل بھی کیا اور خود بھی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا۔ اس اجتماعی جدوجہد کے ذریعے نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں جزیرہ نمائے عرب میں انقلاب برپا ہو گیا۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ایسی جماعت کیسے وجود میں آئی! درحقیقت یہ سب جہاد

بالقرآن کے باعث ممکن ہوا۔ قرآن کے ذریعہ دعوت‘ قرآن کے ذریعہ تذکیر‘ قرآن کے ذریعہ انذار وتبشیر‘ قرآن کے ذریعہ تزکیۂ نفس‘ قرآن کے ساتھ راتوں کا قیام‘ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمِنَ الَّیۡلِ فَتَہَجَّدۡ بِہٖ﴾ (الاسراء:۷۹) ”رات کا ایک حصہ جاگ کر گزارو اس قرآن کے ساتھ“۔ ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ﴾ یہ قرآن ہے‘ اللہ کی طرف سے نازل کردہ وعظ ونصیحت بھی یہ قرآن ہے اور اہل ایمان کے لیے شفاء اور رحمت بھی یہی ہے۔ چنانچہ اس جماعت کی تیاری میں مرکز ومحور قرآن رہا ہے۔ قرآن کو اس کا ذریعہ کہہ لیں‘ اس کا ہتھیار کہہ لیں‘ اس کا آلہ کہہ لیں‘ اس کا نسخہ کہہ لیں‘ یہ سب باتیں قرآن پر راست آئیں گی۔ مولانا حالی نے کیا خوب کہا ہے:

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا   اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

یا بقول علامہ اقبال:

در شبستانِ حرا خلوت گزید   قوم و آئین و حکومت آفرید

جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ

دوسرے جمعہ کی تقریر میں وہ پانچ محاذ گنوائے گئے تھے جن پر اِس وقت دینی اعتبار سے جدوجہد اور کشمکش کی ضرورت ہے۔ ان پانچوں محاذوں کے لیے اصل ہتھیار‘ اصل تلوار قرآن ہے۔ ان محاذوں پر جہاد بالقرآن ہوگا۔

پہلا محاذ جاہلیت قدیمہ کا ہے‘ جس میں مشرکانہ اوہام‘ بدعات اور شفاعتِ باطلہ جیسے تصورات ہیں۔ ان کا توڑ صرف قرآن سے ہوگا۔ اور اس کے لیے محض دورۂ ترجمۂ قرآن بہت کافی ہے۔

دوسرا محاذ جاہلیتِ جدیدہ کا محاذ ہے۔ یعنی الحاد اور مادہ پرستی ہے‘ ہر اُس چیز کا انکار ہے جو انسان کے حواس کی گرفت میں نہ آسکے اور جو قابل تصدیق (verifiable) نہ ہو۔ اس کے لیے بھی تلوار قرآن ہے‘ لیکن یہ ذرا محنت طلب معاملہ ہے اور اس کے لیے قرآن کی حکمت اور اس کے فلسفے کی گہرائیوں میں غوطہ زنی

کر کے علم وحکمت کے موتی نکالنے ہوں گے۔ معرفت الٰہی کے جو حقائق فطرتِ انسانی میں جبلی طور پر مضمر ہیں ان کو قرآنی استدلال کے ذریعے شعور کی سطح پر لانے کی کوشش کرنی ہوگی اور دورِ جدید کی اصطلاحات کے ذریعے قرآنی طرزِ استدلال کا ابلاغ کرنا ہوگا۔ یہ کام اگر نہیں کریں گے تو جاہلیت جدیدہ کا مقابلہ نہایت مشکل ہوگا۔

تیسرا محاذ بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت ہے اور اس کا علاج ہے صحبتِ اصحاب یقین ع صحبت صالح تُرا صالح کند! یہ سب سے زیادہ آسان اور سہل ذریعے ہے‘ لیکن یہ اصحاب یقین بھی قرآن ہی کے ذریعے پیدا ہوں گے۔ ایسے لوگ جب قرآن میں غوطہ زنی کرتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے‘ جو تعلیمات پیش کر رہا ہے‘ جو استدلال کر رہا ہے وہ ان کی بدیہیاتِ فطرت کے مطابق ہے۔ یہ حقائق ان کے باطن میں مضمر ہیں‘ قرآن ان کو واشگاف اور منکشف کر کے تحت الشعور سے شعور کی سطح پر لا رہا ہے۔ اس طرح قرآن ان کا باطنی تجربہ بن جاتا ہے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ چینی میٹھی ہوتی ہے‘ یہ علم الیقین ہے۔ لیکن جب آپ نے اسے چکھا تو آپ کے اس تجربے نے بھی بتا دیا کہ چینی واقعی میٹھی ہے۔ تجربہ سے جو یقین حاصل ہوتا ہے وہ حق الیقین ہے۔ قرآن حکیم پر حق الیقین انسان کو اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ قرآن حکیم پر غور وفکر اور تدبر میں منہمک ہوتا ہے۔ وہ جب اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرتا ہے تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ میرے دل کی آواز ہے‘ میری فطرت اس سے مطابقت رکھتی ہے‘ اور میرا قلب وذہن اسے قبول کر رہا ہے۔ اس احساس سے درحقیقت وہ یقین پیدا ہوتا ہے جسے حق الیقین کہا جائے گا۔ اسی کو علامہ اقبال نے اپنے لیکچرز میں internal experience کہا ہے۔

چوتھا محاذ ہماری نفس پرستیاں اور شیطان کی وسوسہ اندازیاں ہیں۔ ہمارے نفس کے متعلق قرآن مجید ہمیں متنبہ کرتا ہے: ﴿اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) اور: ﴿بَلۡ یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَہٗ ۚ﴾ (القیامۃ) ہمارا نفس لذت کوشیوں اور حرام خوریوں کا عادی ہو چکا ہے۔ ہمیں غلط کاموں کی عادتیں پڑ گئی

ہیں۔ تو ان تمام برائیوں کے لیے تلوار قرآن مجید ہی ہے۔ بقول اقبال:

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است — زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی — کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

ہمارے سامنے پانچواں محاذ فرقہ واریت کا ہے۔ اس فرقہ واریت کی شدت کو کم کرنے اور غیریت کو ختم کرنے کے لیے ہمیں کوئی ایسی جڑ بنیاد اور کوئی ایسا مرکز و محور درکار ہے جو ذہنی ہم آہنگی پیدا کرے اور پھر یہی ذہنی ہم آہنگی لوگوں کے اندر آپس میں قرب اور وابستگی کا ذریعہ بنے۔ فرقہ واریت کے عفریت کا قلع قمع کرنے کے لیے ہمارے پاس واحد تلوار قرآن مجید ہے اور یہی ہماری ذہنی ہم آہنگی اور باہمی قرب اور وابستگی کا واحد ذریعہ ہے۔ یہی سبق ہمیں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے ابتدائی الفاظ میں ملتا ہے: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ جَمِيۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ......﴾ ''اور اللہ کی رسّی کو سب مل جل کر مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں مت پڑو''۔ متعدد احادیثِ نبویؐ میں اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ حبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ معلوم ہوا کہ ان پانچوں محاذوں پر ہمیں قرآن کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔

قرآن کی بنیاد پر اسلامی انقلابی تحریک کی ضرورت

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ پچھلے دو جمعوں کی تقاریر کا خلاصہ بھی ہے اور آج کی گفتگو کے لیے بمنزلۂ تمہید بھی۔ ایک عرصے سے میرے ذہن میں ایک بڑا سوال بلکہ اشکال رہا ہے۔ میں نے جس قدر قرآن کو پڑھا اور اپنی استعداد کے مطابق اس پر غور وفکر کیا' پھر سیرتِ مطہرہ کا معروضی مطالعہ کیا' رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ جن جن مراحل اور اَدوار سے گزری ہے ان پر آپ ﷺ کے منہجِ عمل اور انقلابی لائحہ عمل کو سمجھنے کے لیے سوچ بچار کیا تو اس نتیجہ تک پہنچا کہ قرآن مجید کو مرکز و محور بنا کر ایک دعوت کا آغاز کیا جائے اور ایک خالص اسلامی انقلابی تحریک بپا کرنے کی سعی و جہد کی جائے۔ مجھے کچھ بزرگ ہستیوں کے افکار میں اس کی بھرپور تائید بھی ملی۔ میرے نزدیک

چودہویں صدی ہجری میں دو عظیم ترین شخصیتیں گزری ہیں' نہ صرف برعظیم پاک و ہند کی حد تک بلکہ میرے اندازے کے مطابق پورے عالمِ اسلامی کی حد تک۔ ان میں سے ایک علامہ اقبال ہیں جو سکولوں' کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے تھے اور انہوں نے قدیم و جدید مکاتیبِ فکر کا معروضی مطالعہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے:

عذابِ دانشِ حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

اور دوسری شخصیت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ ہیں' جو دار العلوموں کی فضا سے نکلے تھے اور علمائے حقانی کے صحبت یافتہ اور فیض یافتہ تھے۔ یہ ہیں میرے نزدیک دو عظیم ترین شخصیتیں۔ ان میں سے حضرت شیخ الہندؒ کو میں چودہویں صدی کا مجدد مانتا ہوں۔ قرآن کی بنیاد پر اسلامی انقلابی تحریک برپا کرنے کی کوشش میں مجھے ان دونوں کی طرف سے تائید ملی۔ علامہ اقبال کے اشعار میں مسلمانوں کو رجوع الی القرآن کا بھرپور سبق دیا گیا ہے۔ مثلاً:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

معلوم ہوا کہ ہمارے سامنے تجدید و احیائے دین کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم کی طرف رجوع کریں۔ چنانچہ علامہ نے کتنے پُر تاثیر اسلوب سے کہا ہے:

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی — شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ — در بغل داری کتابِ زندۂ

اُمت مسلمہ کے زوال کا سبب قرآن سے دوری و مہجوری ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ مسلمان اس کتابِ زندہ پر عمل پیرا ہو جو وہ بغل میں دبائے بیٹھا ہے یا اسے پیٹھ پیچھے ڈال رکھا ہے۔(۲) یہی عصائے موسیٰ ہے جو ہمارے پاس ہے' بلکہ میں بلا ارادہ تنقیص عرض کر رہا ہوں کہ عصائے موسویؑ کی تو قرآن کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی

نہیں ہے۔ اس لیے کہ عصائے موسیٰ کی معجز نمائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہی رخصت ہوئی، جب کہ نبی اکرم ﷺ کا لایا ہوا معجزہ قرآن مجید آج بھی زندہ ہے اور تاقیامِ قیامت زندہ و پائندہ رہے گا۔ اس کا یہ چیلنج جو چودہ صدی قبل دیا گیا تھا، قیامِ قیامت تک باقی رہے گا: ﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ......﴾ (البقرۃ:۲۳) ’’اور اگر تم اس چیز کے بارے میں کسی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو اس کے مانند ایک سورت ہی لے آؤ......‘‘۔

علامہ اقبال کی ولولہ انگیز ملی شاعری سے تو میں زمانۂ طالب علمی ہی سے روشناس ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب وہ ۱۹۲۰ء میں اسارتِ مالٹا سے رہائی پا کر وطن واپس آئے تو رجوع الی القرآن کی دعوت کو اپنا مقصدِ حیات بنانے کے عزم کا اظہار فرمایا۔ انگریزوں نے حضرت کو اُس وقت چھوڑا تھا جب وہ ٹی بی کی تھرڈ سٹیج کو پہنچ چکے تھے، ورنہ وہ اس مردِ حق پرست کو کب چھوڑنے والا تھا! حضرت شیخ الہند نے دارالعلوم دیوبند میں ایک عظیم بات ارشاد فرمائی، جسے مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ’’وحدتِ اُمت‘‘ میں یوں نقل فرمایا ہے:

> ’’مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے۔ علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا، اُس وقت فرمایا کہ ’’ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں‘‘۔ یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسّی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں؟ (حضرت شیخ الہندؒ نے) فرمایا:
>
> ’’میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا، دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے

> لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں، بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے‘‘۔

میں حیران ہوتا ہوں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۲۰ء میں یہ لفظ ’’عوامی‘‘ استعمال فرمایا جبکہ عوام و خواص میں سے کسی کی زبان پر یہ لفظ نہیں آیا تھا، جیسا کہ ’’عوامی‘‘ کا لفظ ہمارے دور میں عام ہو گیا ہے۔ یہ بھی ان کی دور بینی اور دور اندیشی کی دلیل ہے۔ نابغہ (Genius) اسی شخص کو کہتے ہیں جو بہت بعد کے حالات کو دیکھ رہا ہو۔

مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی اس بات پر بڑا خوبصورت اور بڑا موزوں تبصرہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ’’آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث و آفات سے دوچار ہیں، اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے، قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا۔ غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی‘‘۔

حضرت شیخ الہندؒ اور مفتی محمد شفیعؒ کے خیالات و آراء سے مجھے واقعتاً بڑی تقویت ملی کہ میں نے اپنے غور و فکر اور سوچ بچار کے نتیجے میں دعوت رجوع الی القرآن کا جو کام شروع کر رکھا ہے اس کی تائید ان دو حضرات کی آراء سے حاصل ہو گئی۔ فللّٰہ الحمد والمنّة۔

علماء کرام کے خدشات اور ان کا اصل سبب

ایک طرف تو صورتِ حال یہ تھی، دوسری طرف مجھے شروع ہی سے ایک دوسرے تجربے سے مسلسل سابقہ پیش آتا رہا۔ میں نے اس کام کا آغاز اسی شہر لاہور سے کیا تھا اور میں بحمد اللہ اسی کام میں مسلسل لگا ہوا ہوں اور اپنی زندگی اسی کام کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ تجربہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے یہ کام اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے آگے بڑھنا

شروع ہوا تو چند علماء کی طرف سے کچھ مخالفت بھی شروع ہوگئی۔ ان کی جانب سے کچھ اندیشوں‘ کچھ خطروں کا اظہار ہونے لگا کہ یہ دعوت ہے کیا؟ کہیں قرآن کا نام لے کر کوئی نیا فتنہ تو نہیں اٹھ رہا؟ میں حیران ہوتا تھا کہ اس کا سبب کیا ہے؟ پھر یہ کہ مخالفت صرف ایسے علماء کی طرف سے نہیں تھی کہ جن کے بارے میں لوگوں کی رائے اچھی نہ ہو‘ بلکہ وہ ثقہ علماء بھی جن کا میرے اپنے دل میں بڑا احترام ہے اور جن کے ساتھ میرا حسنِ عقیدت کا معاملہ ہے‘ تشویش میں مبتلا نظر آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ سب کے سب اس سے الرجک (allergic) ہیں اور قرآن کے نام کی دعوت سے بہت گھبراتے ہیں۔ انہیں کچھ اندیشہ ہوتا ہے کہ قرآن کے نام پر اٹھنے والی دعوت کے پس پردہ کہیں انکارِ سنت اور انکارِ حدیث کا معاملہ نہ ہو۔ چنانچہ اس طرح کا کچھ تجربہ مسلسل ہوا۔

یہ بات میرے لیے ایک پریشانی کا موجب تو رہی لیکن میں بحمد اللہ کام میں لگا رہا۔ اس لیے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مزاج کچھ ایسا دیا ہے‘ اور بچپن ہی سے میرا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ جو بات حق معلوم ہو اُس پر ڈٹے رہو۔ میری عمر چوبیس برس کی تھی جب میں نے جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع منعقدہ ماچھی گوٹھ میں کھڑے ہو کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم سے جماعت کے انقلابی طریقہ کار کو چھوڑ کر انتخابی طریق کار اختیار کرنے کی پالیسی سے ڈٹ کر اختلاف کیا تھا۔ مولانا مرحوم میرے والد کی عمر کے تھے‘ پھر میرے محسن بھی تھے کہ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے مجھے دین کا صحیح مفہوم اور ایک مسلمان کی دینی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہوا تھا‘ جس پر محکم یقین مطالعۂ قرآن سے حاصل ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مزاج ایسا دیا ہے کہ جو بات سمجھ میں آتی ہے کہ درست ہے اس کا برملا اظہار کیا جائے۔ لہٰذا مولانا مودودی مرحوم کی انتخابی سیاست کے موقف پر میں نے جماعت اسلامی کا رکن رہتے ہوئے اپنا اختلافی موقف دلائل کے ساتھ تحریری شکل میں بھی پیش کیا اور ماچھی گوٹھ میں اسٹیج پر کھڑے ہو کر بھی(۲)۔ اگر کوئی دلیل سے میری رائے اور میرے موقف کو غلط ثابت کر دے تب تو میں فوراً ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوتا ہوں اور اپنی غلطی تسلیم کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں

کرتا‘ لیکن اگر کوئی اسے دلیل سے غلط ثابت نہیں کرتا تو مجھے اس کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ میری بات کی کون مخالفت کر رہا ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے یہ مزاج دیا ہے۔

اس اعتبار سے میرا جو مزاج ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں مسلسل یہ سوچتا تو ضرور رہا کہ آخر علماء کرام کو یہ الرجی کیوں ہے‘ وہ کیوں بدظن ہیں؟ قرآن کی طرف دعوت پر کیوں ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ اندیشے اور خدشات محسوس کرنے لگتے ہیں؟ لیکن چونکہ کوئی ٹھوس بات سامنے نہیں آئی تو میں اپنی دھن میں لگا رہا اور میں نے اپنے کام میں قطعاً کوئی ڈھیل نہیں آنے دی۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے مجھے اس معمے کا حل مل گیا اور علماءِ کرام کے طرزِ عمل اور رویہ کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ ہمارے علماء کی طرف سے‘ بالخصوص ان کی طرف سے جن کا ہمارے قدیم دینی حلقوں سے تعلق ہے‘ جن اندیشوں اور خدشات کا اظہار ہوتا ہے‘ اصل میں اس کا سبب ان کا ایک طویل تجربہ ہے۔ وہ تجربہ یہ ہے کہ ماضی بعید و قریب میں مسلمانوں میں جتنی بھی گمراہ تحریکیں اٹھیں وہ سب قرآن کا نام لے کر اٹھیں۔ مثلاً چکڑالویت اٹھی قرآن کے نام پر۔ اسی طرح پرویزیت اٹھی قرآن کے نام پر۔ اور تو اور قادیانیت بھی قرآن کے نام پر ہی اٹھی تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے کام کی ابتداء قرآن کی عظمت کے بیان سے کی تھی۔ ان گمراہ تحریکوں کی تکنیک اور طریق کار (methodology) مَیں آگے چل کر قدرے تفصیل سے ذکر کروں گا۔

ان سب سے پہلے سرسید احمد خان نے قرآن کے نام پر بہت سی گمراہیوں کا آغاز کیا۔ تو معلوم ہوا کہ جسدِ ملّی پر پے بہ پے اتنے چرکے لگے ہیں اور علماء کو اُن تحریکات سے ایسے غلط تجربات ہوئے ہیں کہ وہ اس معاملے میں بہت حساس ہو گئے ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں کہاوت ہے کہ ’’دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے‘‘۔ یا ایک دوسری کہاوت ہے کہ ’’سانپ کا ڈسا ہوا رسّی سے بھی ڈرتا ہے‘‘۔ چنانچہ ہمارے دینی حلقوں کو قرآن کے نام پر اٹھنے والی کسی بھی دعوت اور تحریک کے بارے میں فوراً

ایک خطرہ' ایک اندیشہ اور ایک سوءِظن لاحق ہو جاتا ہے اور ان کی جانب سے خدشات کا برملا اظہار ہونے لگتا ہے جو مخالفت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

علمائے کرام کے بارے میں مَیں یہ بات صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ ان حضرات کا احترام ملحوظ رکھنے اور ان سے حسنِ عقیدت رکھنے کے باوصف میں ان کے بارے میں کسی غلو اور افراط وتفریط میں مبتلا نہیں ہوں۔ ہمارے یہاں جو علماء پائے جاتے ہیں ان میں علمائے حق بھی ہیں اور علمائے سوء بھی۔ علمائے سوء سے کوئی زمانہ کبھی خالی نہیں رہا۔ علمائے سوء اُس زمانے میں بھی سرکار دربار سے بھی متعلق رہے اور عوام الناس سے بھی جو زمانہ کئی اعتبارات سے ہمارے دور سے کہیں بہتر تھا۔ دنیاداری اور اصحابِ اختیار و اقتدار کی خوشنودی کے حصول کا معاملہ بہرحال ہر دور میں رہا ہے۔ امامِ دارالہجرت امام مالکؒ کی جب مشکیں کس کر' منہ پر سیاہی مَل کر گدھے پر سوار کر کے مدینہ کی گلیوں میں گھمایا گیا تھا' جب امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کو جیل میں ڈالا گیا تھا' جب امام شافعیؒ کے لیے بار بار شہربدر ہونے کے احکام جاری ہوتے رہتے تھے' جب امام احمد بن حنبلؒ کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں اور وہ مار سہنی پڑی کہ اگر ہاتھی کو بھی اس طرح مارا جائے تو وہ بلبلا اٹھے' جب امام ابن تیمیہؒ کو جیل میں ڈالا گیا اور وہیں انہوں نے اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی' جب مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کو قید کیا گیا' اور جب چند خوانین سرحد نے بیعت قبول کرنے کے باوصف بھی سید احمد بریلویؒ سے غداری کی تو کیا آپ کے خیال میں ان تمام افعال کی پشت پر علمائے سوء کے فتاویٰ موجود نہیں تھے جو وقت کے صاحبانِ اقتدار و اختیار کی خوشنودی کے لیے دیے گئے تھے؟ دنیادار اور فتویٰ فروش علمائے سوء ہر دَور میں موجود رہے ہیں۔ ہمارا زمانہ تو ظاہر بات ہے کہ فتنہ کے اعتبار سے اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ علماءِ سو کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے اُمت کو پیشگی متنبہ فرما دیا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((یُوْشِکُ اَنْ یَّاْتِیَ عَلَی النَّاسِ زَمَانٌ لَا یَبْقٰی مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُہٗ '

وَلَا یَبْقٰی مِنَ الْقُرْاٰنِ اِلَّا رَسْمُہٗ' مَسَاجِدُھُمْ عَامِرَۃٌ وَھِیَ خَرَابٌ مِنَ الْھُدٰی' عُلَمَاؤُھُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ اَدِیْمِ السَّمَاءِ ' مِنْ عِنْدِھِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَۃُ وَفِیْھِمْ تَعُوْدُ))(۴)

''اندیشہ ہے کہ لوگوں کو ایک ایسے زمانے سے سابقہ پیش آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ نہ بچے گا (اسلام پر عمل ختم ہو جائے گا' صرف اس کا نام باقی رہ جائے گا) اور قرآن میں سے سوائے اس کے رسم الخط کے کچھ نہ بچے گا (قرآن پر عمل ترک ہو جائے گا اور اس کے الفاظ کی محض تلاوت باقی رہ جائے گی)۔ مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہو جائیں گی۔ ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے کے بدترین انسان ہوں گے۔ سارے فتنے ان ہی میں سے برآمد ہوں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے۔''

نبی اکرم ﷺ نے جہاں یہ انتباہ فرمایا وہاں یہ بشارت بھی دی کہ علمائے حقانی سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہے گا۔ یہ ضمانت دی ہے محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے کہ: ((لَا تَزَالُ طَائِفَۃٌ مِّنْ اُمَّتِیْ ظَاھِرِیْنَ عَلَی الْحَقِّ))(۵) ''میری اُمت میں ہمیشہ ایک گروہ حق پر ثابت قدم رہے گا''۔ ظاہر بات ہے کہ علمائے حق کے بغیر دین کا کوئی تصور ہی نہیں' لہٰذا ہر دَور' ہر زمان' ہر مکان میں علمائے حقانی بھی لازماً موجود رہیں گے۔ پس یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ پر ہیں۔ جہاں تک علمائے سوء کا معاملہ ہے' ان کی باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے' لیکن اگر علمائے حق کی طرف سے تشویش کا اظہار ہو' اگر انہیں بھی خطرات وخدشات اور اندیشے محسوس ہوں تو یقیناً قابل غور مسئلہ ہے۔ ان علماءِ حق کی تشویش اگر وہ شخص نظرانداز کر دے گا جو خادمِ دین' خادمِ قرآن اور خادمِ ملت ہو تو وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارے گا' کسی اور کا نقصان نہیں کرے گا۔ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے دس بیس یا سو پچاس ہم خیال پیدا کر کے دنیا سے چلا جائے تو یہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس میں ذرا سی ذہانت اور صلاحیت ہو۔ کچھ نہ کچھ لوگ اسے لازماً مل جائیں گے جو اُس کے حواری بن جائیں گے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پیش

نظریہ ہے کہ دین کی ایک ہمہ گیر دعوت اٹھا کر اقامت دین اور اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کرے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی کودن اور احمق شخص ہی ہوگا جو یہ سمجھتا اور توقع رکھتا ہو کہ علمائے حق کی اشیر باد کے بغیر، علمائے حقانی کی تائید وتعاون کے بغیر اور اصحابِ علم وفضل کی دعاؤں کے بغیر کوئی ایسی تحریک پروان چڑھ سکے گی اور نتیجہ خیز ہو سکے گی۔ ایسی دعوت وتحریک کے داعی کے لیے، اگر وہ مخلص ہے، ان علمائے حقانی کا اعتماد حاصل کرنا لازم ہے۔ میں اس مسئلہ پر مسلسل غور کرتا رہا کہ آخر کیا بات ہے کہ جن حضراتِ گرامی کو میں علمائے حق گردانتا ہوں، جن سے حسنِ عقیدت رکھتا ہوں مجھے ان کا تعاون حاصل نہیں ہو رہا۔ بلکہ کبھی دبی دبی زبان سے اور کبھی برملا ان کی طرف سے اختلاف کا اظہار ہو رہا ہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے میری رہنمائی فرمائی اور یہ عقدہ کھل گیا کہ ان علمائے حقانی کے خدشات کا سبب وہ گمراہ کن نظریات اور تحریکیں ہیں جو اِس برعظیم پاک وہند میں قریباً ایک صدی کے دوران وقتاً فوقتاً قرآن کے نام پر اٹھتی رہی ہیں۔ میں ان کی طرف ابتدا میں اشارہ کر چکا ہوں، اب میں قدرے تفصیل سے ان کے متعلق کچھ باتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کی نام نہاد حکومت بالکل ختم ہوگئی اور برعظیم پاک وہند پر سیاسی اعتبار سے حکومت برطانیہ کا تسلط واستیلاء کامل طور پر ہوگیا تو غلامی کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک یہ نوے سال کا دَور ہے۔ اس دَور میں قرآن کے حوالے سے جو سب سے پہلی زوردار آواز اٹھی وہ سرسید احمد خان کی ہے۔ انہوں نے پندرہ پاروں کی تفسیر بھی لکھی۔ انہوں نے قرآن کی تفسیر میں طرح طرح کے فتنے اٹھا دیے۔ مثلاً جنات کا انکار، فرشتوں کا انکار، وحی کا قریباً انکار۔ انہوں نے ان سب کی ایسی توجیہہ وتأویل کی جو سراسر قرآن کے خلاف تھی، ظاہر بات ہے کہ کھلم کھلا انکار تو کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے جنات کا برملا انکار نہیں کیا، لیکن یہ کہا کہ قرآن نے مشتعل مزاج اور اُجڈ قسم کے لوگوں کو ''جن'' سے تعبیر کیا ہے، وہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں ہے۔ فرشتوں کا بھی برملا انکار تو نہیں کیا، لیکن کہا کہ قوانینِ فطرت میں جو قوتیں

(Forces of the Nature) کارفرما ہیں ان کو فرشتے کہا گیا ہے، ان کا کوئی علیحدہ وجود نہیں، وہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں۔ معجزات کی یہ تأویل کی گئی کہ یہ طبیعیات کے عجیب وغریب اور غیر معمولی مظاہر (Physical Phenomena) تھے، ان کو خواہ مخواہ معجزات سمجھ لیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر سمندر سے نکل گئے اور فرعون کا لشکر غرق ہوگیا تو یہ مدّ وجزر کا کرشمہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جزر کی کیفیت میں بنی اسرائیل کے ساتھ سمندر عبور کر گئے، لیکن جب فرعون اپنے لشکر کو لے کر سمندر میں اترا تو سمندر مدّ پر آ گیا اور آلِ فرعون اس کی لہروں کی نذر ہو گئے۔ گویا اپنے دَور کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ مصری قوم مدّ وجزر سے ناواقف تھی۔ سرسید احمد خان نے ایسی گمراہ کن تأویلات کی ہیں، اگرچہ کھلم کھلا انکار کسی چیز کا نہیں کیا۔ ان کی پیدا کردہ گمراہیوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ میں نے اس موضوع پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جو میری کتاب ''اسلام اور پاکستان'' میں شامل ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنی کتاب ''اسلام'' میں وحی کے بارے میں یہ گمراہ کن خیال ظاہر کیا تھا کہ قرآن سارے کا سارا بیک وقت خدا کا کلام بھی ہے اور کلامِ رسولؐ بھی، وحی ایک چشمہ کے مانند قلب محمدیؐ میں پھوٹی تھی۔ متذکرہ بالا مضمون میں مَیں نے لکھا تھا کہ اس گمراہی کا آغاز کرنے والے تو سرسید احمد خان ہیں، یہ گمراہی تو نہ معلوم کتنی جگہ انڈے بچے دے چکی ہے۔ چنانچہ سرسید اس کے قائل نہیں تھے کہ جبریل امین علیہ السلام وحی لے کر نازل ہوتے تھے۔ اس طرح تو فرشتوں کا تشخص تسلیم کرنا پڑتا، جس کے وہ انکاری تھے۔ ان کا شعر ہے:

ز جبریلِ امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم
ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

''جو قرآن جبریل امین لے کر آئے مجھے وہ نہیں چاہیے۔ میرے پاس جو قرآن ہے وہ تو سارے کا سارا میرے محبوب (محمد مصطفیٰ ﷺ) کی گفتگو ہے۔''

تفسیر قرآن میں ان گمراہ کن تأویلات کے باوجود ایک اچھی بات سرسید احمد خاں کے حق میں جاتی ہے کہ نہ تو انہوں نے کوئی دینی جماعت بنائی اور نہ ہی کسی دینی

فرقے کا آغاز کیا۔ وہ اصل میں ایک سماجی مصلح (social reformer) اور مسلمانوں کے ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ چونکہ ان کا دینی معاملہ صرف نظریات کی حد تک رہا اور انہوں نے ان کی بنیاد پر کوئی تنظیم یا جماعت نہیں بنائی‘ لہٰذا انہوں نے ایک اجتماعی فتنے کی شکل اختیار نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام نے ان کا زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ پھر مسلمانانِ ہند پر دوسرے اعتبارات سے ان کے احسانات بھی ہیں‘ لہٰذا ان کے معاملہ میں کسی حد تک نرمی کا معاملہ کیا جاتا رہا۔

لیکن اس کے پہلو بہ پہلو برعظیم پاک و ہند میں جو ایک بڑا فتنہ اٹھا اس کا بانی تھا مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی۔ اس نے اپنی تحریک کا آغاز کیا تو قرآن کے نام پر بات شروع کی۔ اُس کے ابتدائی دَور کے دو شعر ملاحظہ کیجیے‘ جن سے معلوم ہوگا کہ شروع شروع میں اس نے اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لیے کس طرح خدمت قرآن کا لبادہ اوڑھا۔ اس کا ایک شعر ہے:

جمال و حسنِ قرآں نورِ جانِ ہر مسلماں ہے
قمر ہے چاند اوروں کا‘ ہمارا چاند قرآں ہے!

دوسرا شعر ہے:

اے بے خبر بخدمتِ قرآں کمر بہ بند
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند (۶)

’’اے بے خبر مسلمان! قرآن کی خدمت کے لیے کمر کس کر تیار ہو جاؤ‘ اس سے پہلے کہ آواز لگائی جائے کہ فلاں شخص اس دنیا سے رخصت ہوگیا۔ (یعنی موت سے پہلے پہلے جو فرصت میسر ہے اسے قرآن کی خدمت کے لیے لگاؤ)‘‘۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ اس کی تکنیک کیا تھی۔ پھر اس نے آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں سے بڑے کامیاب مناظرے کیے۔ ان سب کا ذکر آپ کو اس کے ابتدائی لٹریچر میں مل جائے گا۔ لیکن اس شخص نے اپنا اعتماد پیدا کرنے کے بعد وہ گمراہی پھیلائی جو سرطان کی طرح جسدِ ملّی سے چمٹ گئی۔ جب لوگوں کا کثیر تعداد میں اس کی طرف رجوع ہوا اور عقیدت مندوں کی ایک معتد بہ تعداد اس کے گرد جمع ہوگئی تو اس

کے دماغ کے اصل خنّاس نے ظہور شروع کیا۔ چنانچہ شیطان نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور سبز باغ دکھانے شروع کیے تو اس نے پے در پے دعووں کا آغاز کر دیا۔ کہیں مجدّد ہونے کا دعویٰ کیا تو کہیں مسیح موعود ہونے کا۔ پھر اس سے آگے بڑھ کر ظلی اور بروزی نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور بالآخر صاحبِ وحی نبی ہونے کا دعویٰ کر بیٹھا۔ بعض علمائے کرام اور اہل قلم نے اس کے لٹریچر سے اس کی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی تصویر پیش کی ہے۔ اس کی تحریروں کو پڑھ کر انسان حیران ہوتا ہے کہ ایسا شخص تو صحیح العقل انسان بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا‘ کجا یہ کہ اسے نبی مان لیا جائے۔ مزید حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ اس کے پیچھے لگ گئے اور اس پر بحیثیت نبی ایمان لے آئے۔ ان میں سے کوئی انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کا جج رہا ہے اور کوئی نوبل پرائز یافتہ ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ مرزا غلام احمد کو انگریزی سرکار کی سرپرستی حاصل ہوگئی تھی لہٰذا اس کے متبعین کو حکومت کی طرف سے بڑی مراعات ملیں‘ ان کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع حاصل ہوئے اور وہ سرکاری ملازمتوں اور منصبوں پر فائز ہوتے رہے۔ اس طرح مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان لانا دُنیوی ترقی اور انگریزی دورِ حکومت میں اثر و رسوخ نیز اعلیٰ ملازمتوں کے حصول کا زینہ بن گیا۔ بہرحال دعوتِ قرآن کا نام لے کر اٹھنے والا یہ دوسرا فتنہ تھا جس سے مسلمانوں کو بہت بڑا چرکہ لگا۔

پھر ہمارے دَور میں غلام احمد پرویز نے جو گمراہی پھیلائی اور جو مسلسل پھیل رہی ہے وہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ چکڑالویت‘ پرویزیت اور دوسرے منکرین سنت کے جو مختلف shades ہیں‘ ان کا تو سارے کا سارا اوڑھنا بچھونا قرآن کا نام ہے۔ ’’قرآنی نظامِ ربوبیت‘‘ کے عنوان سے وہ نظریۂ اشتراکیت اور الحاد کے علمبردار ہیں۔ ان کے نزدیک نبی اکرم ﷺ صرف اپنے دَور کی حد تک واجب الاطاعت تھے (معاذ اللہ!) اور وہ بھی ’’مرکزِ ملت‘‘ کی حیثیت سے نہ کہ رسول کی حیثیت سے۔ رسول کی حیثیت سے تو بس ان کا کام قرآن کو پہنچانا اور حالات و ظروف کے مطابق اس کی عملی

تعبیر (interpretation) کرنا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے دنیا کو شریعت کا جو نظام دیا تھا' جس کا کامل ظہور خلافت راشدہ کے دورِ سعید میں ہوا' ان منکرین حدیث وسنت کے نزدیک وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اپنے دور کا ''مرکزِ ملت'' قرآن سے اصول لے کر شریعت کا نظام رائج کرنے کا مطلقاً مختار ومجاز ہے۔ صلوٰۃ' زکوٰۃ' صوم اور حج کو وہ مستقل ارکانِ اسلام تسلیم نہیں کرتے' بلکہ ان کی رائے میں احوال وظروف کے مطابق ان میں تغیر وتبدل ہوسکتا ہے اور لازماً ہونا چاہیے۔ یہ گمراہ کن تحریک قرآن کے نام پر اٹھی اور اسی نام پر وہ ہمارے معاشرے میں گمراہی پھیلا رہی ہے۔

اس طرح ہمارے علمائے حق کو پے بہ پے یہ جو چرکے لگے ہیں اور تجربات ہوئے ہیں' ان کی وجہ سے وہ اس معاملے میں بہت ہی متردّد اور فکرمند ہو جاتے ہیں کہ کچھ لوگ قرآن کا نام لے کر آگے آ رہے ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶ میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ﴾ یعنی اس قرآن ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور اسی قرآن کے ذریعے بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ اصل میں فیصلہ کن چیز انسان کی اپنی باطنی کیفیت ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص میں عجب ہے' تکبر ہے' استکبار ہے' شہرت و وجاہت طلبی ہے' کچھ بننے کی آرزو ہے' اپنی عقل وفہم پر اعتماد میں غلو ہے' اپنی بڑائی اور انفرادیت کے اظہار کی خواہش اور شوق ہے' وہ کسی پندار اور گھمنڈ میں مبتلا ہے تو اس کا چاہے صبح وشام قرآن مجید سے کتنا ہی اعتناء اور تعلق ہو' ایسا شخص آج نہیں تو کل خود بھی فتنے میں مبتلا ہوگا اور بہتوں کو فتنے میں مبتلا کرنے کا باعث بن جائے گا۔ لیکن اگر اس کی طبیعت میں خلوص واخلاص ہے' تواضع ہے' انکسار ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں قرآن کی جو خدمت کر رہا ہوں وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے کر رہا ہوں' اس میں میرے کسی ذاتی کمال کو کوئی دخل نہیں ہے' تو اِن شاء اللہ العزیز قرآن مجید اس پر اپنی ہدایت روشن کرتا چلا جائے گا۔

گمراہ فرقوں اور تحریکوں کا طریقِ واردات

اب اس ضمن میں ایک اہم بات جان لیجیے کہ ان تمام گمراہ فرقوں اور تحریکوں کا اصل طریقۂ واردات (methodology) کیا ہے۔ اور یہ سب میں مشترک وصف ہے۔ اس مسئلہ پر میں اپنے غور وفکر کے نتائج اور اپنے خیالات وضاحت سے آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ ان کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک آدھ مسئلہ کو پکڑ کر' جو اُمت میں متفق علیہ اور مجمع علیہ رہا ہے' اس پر شکوک وشبہات پیدا کر دیتے ہیں۔ اُمت کے تمام فقہائے کرام' محدثین عظام' علمائے حقانی اور مفسرین کرام سب کے سب اس مسئلہ کو مانتے چلے آرہے ہیں' لیکن اس ایک مسئلہ کو اٹھا کر وہ لوگوں کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ اس ایک تیر سے کتنے شکار ہو گئے؟ اگر آپ نے ایک متفق علیہ مسئلہ کے بارے میں لوگوں کو بدظن کر دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ذہن وقلب میں یہ بات بٹھا دی کہ سارے فقہاء بے وقوف تھے' سارے محدثین ناسمجھ تھے' سارے مفسرین بے علم تھے' سارے علماءِ اُمت بے عقل تھے کہ اتنی سیدھی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی جو ہمارے ممدوح کی سمجھ میں آئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو عموماً ایسے لوگوں کو تمام اکابر اسلاف سے سوءِ ظن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ اُس بے لنگر جہاز کے مانند ہیں جو لہروں کے رحم وکرم پر ہے' لہریں اس جہاز کو جدھر چاہیں لے جائیں۔ یا کٹی ہوئی پتنگ کے موافق ہیں جو ہوا کے رحم وکرم پر ہے' وہ اسے جدھر چاہے لے جائے۔

اب جیسے ہی اسلاف سے بدظنی پیدا ہوئی شیطان کو موقع مل گیا کہ وہ گمراہی پر گمراہی کا دروازہ کھولتا چلا جائے اور ''ظُلُمٰتٌۢ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' کا نقشہ جما دے۔ اس لیے کہ ان کے دلوں میں تو عظمت کا سکہ اپنے ممدوح کا بیٹھ جاتا ہے کہ جو بات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سمجھ میں نہیں آئی' امام ابوحنیفہؒ کے پلے نہیں پڑی' امام مالکؒ کے ذہن کی جہاں تک رسائی نہیں ہوئی' امام شافعیؒ جس کو سمجھنے سے قاصر رہے' امام احمد بن حنبلؒ جس کی تہہ تک نہ پہنچ پائے' مزید یہ کہ اُمت کے تمام قابل اعتماد

مفسرین، چاہے وہ متقدمین میں سے ہوں یا متأخرین میں سے، جس بات کے فہم سے عاری رہے، تمام علمائے حقانی کی عقل جس بات کے سمجھنے سے عاجز رہی وہ آج ان کی سمجھ میں آئی ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ قرنِ اوّل سے آج تک جس مسئلہ میں پوری اُمت کا تواتر کے ساتھ اجماع رہا ہے وہ غلط رہا ہے، اس مسئلہ کا صحیح عقدہ تو ہمارے ممدوح عالم دین اور مفسر قرآن پر منکشف ہوا ہے۔ عقیدت مند لوگ جب اجماعِ اُمت کے خلاف ایک مسئلہ میں اپنے ممدوح کی رائے کو مان لیں تو بہت آسان ہوگیا کہ وہ جو چاہے زہر گھول دے، جو کڑوی گولی چاہے اپنے عقیدت مندوں کے حلق سے اتروا دے۔ یہ ہے ان کا مشترک طریق کار (methodology)۔

ان لوگوں کو معتقدین کس طرح اور کہاں سے ملتے ہیں جو اس فتنہ کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں، یہ بات بھی تجزیہ طلب ہے۔ عموماً وہ جدید تعلیم یافتہ لوگ جو دین کے نہ طالب علم ہوتے ہیں نہ انہوں نے خود دین کا بنیادی طور پر مطالعہ کیا ہوتا ہے، اس طرح کے فتنہ پردازوں کے حلقہ بگوش بن جاتے ہیں۔ دُنیوی تعلیم کے اعتبار سے وہ چاہے گریجویٹ ہوں یا ماسٹرز ڈگری رکھتے ہوں، علوم جدیدہ میں سے کسی علم میں پی ایچ ڈی ہوں، کوئی قانون میں بار ایٹ لاء ہو، کوئی ملکی آئین میں درجۂ تخصص رکھتا ہو، کسی نے سائنس اور انجینئرنگ کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کی ہوں، لیکن دین کے بنیادی علم سے انہیں کوئی شغف نہیں ہوتا، اس کا کوئی فہم نہیں ہوتا، اس معاملہ میں بالکل کورے ہوتے ہیں، اِلّا ماشاءاللہ۔ زیادہ سے زیادہ تقلیدِ آباء کے طور پر نماز روزے سے کچھ تعلق ہوتو ہو۔ اس طبقے کے متعلق ایک بزرگ بجا طور پر ''پڑھے لکھے جاہل'' کی اصطلاح استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دین کے اعتبار سے تو یہ اَن پڑھ ہیں۔ اس طبقے میں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ انہیں ناظرہ قرآن تک پڑھنا نہیں آتا۔ یہ طبقہ ہے جس میں سے اکثر لوگ فتنہ اٹھانے والوں کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔ انہیں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ دین اور قرآن کے بڑے خادم ہیں، بڑے عالم ہیں، بڑے معقول لوگ ہیں، بڑے ذہین وفطین ہیں، ان کی ذہانت وفطانت کا دنیا میں لوہا مانا جا رہا ہے، لیکن

چونکہ ان کا براہِ راست دین کا اپنا مطالعہ نہیں ہوتا لہٰذا جس شخص کو بھی انہوں نے اس طور سے مان لیا کہ دین کی فلاں اہم بات اس کی سمجھ میں آئی ہے جو آج تک کسی اور کی سمجھ میں نہیں آئی تھی تو پھر وہ شخص ایسے لوگوں کو جدھر چاہے لے جائے۔ پھر ایسے لوگ اندھے اور بہرے ہو کر اس کی پیروی کرتے ہیں۔ بغرضِ تفہیم میں چند مثالیں قدرے تفصیل سے پیش کرتا ہوں۔

سرسید احمد خان کا اس موقع پر میں تذکرہ نہیں کروں گا۔ وہ جن گمراہیوں کے بانی ومبانی تھے ان کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ ان کی ذات سے کوئی فرقہ، کوئی جماعت، کوئی تنظیم وجود میں نہیں آئی۔ انہوں نے سماجی طور پر مسلمانوں کی خدمت کو اپنا میدانِ عمل بنایا اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ اس میدان میں انہوں نے مسلمانانِ پاک وہند کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ لہٰذا سرسید کی بات یہیں چھوڑ دیجیے۔

اب آپ دیکھئے مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا کیا؟ اس نے جب ابتداءً قرآن کا نام لے کر اور آریہ سماجیوں اور عیسائیوں سے مناظرے کر کے اپنا ایک مقام بنا لیا اور معتد بہ افراد اُس کے حلقۂ ارادت وعقیدت سے وابستہ ہو گئے تو اس نے ایک مسئلہ اٹھایا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا اپنے جسدِ خاکی کے ساتھ زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا اور پھر قیامت سے قبل ان کا بعینہٖ بنفسِ نفیس دوبارہ آسمان سے نازل ہونا، یہ وہ مسئلہ ہے جو اُمت کا متفق علیہ عقیدہ ہے اور سلف سے لے کر خلف تک اس پر پوری اُمت کا اجماع چلا آ رہا ہے۔ اس کا قرآن حکیم میں بھی ذکر ہے اور متعدد احادیثِ صحیحہ صراحت کے ساتھ اس مسئلہ پر موجود ہیں۔ تمام فقہاءِ اُمتؒ، تمام محدثین کرامؒ اور اُمت کے تمام قابل اعتماد مفکرین ومفسرین اس کو مانتے ہیں، لیکن غلام احمد قادیانی نے ''رفع ونزولِ مسیح'' کے انکار کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ چونکہ وہ دَور سائنسی عقلیت پرستی (scientific rationalism) کا دَور تھا اور سائنس بھی ابھی نیوٹن کے دور میں تھی، آئن سٹائن کا دَور شروع نہیں ہوا تھا، لہٰذا اُس زمانے میں یہ بات ایک انگریزی دان

اورعقلیت زدہ شخص کے لیے بڑی عجیب سی تھی کہ ایک زندہ انسان آسمان پر اٹھایا جا سکتا ہے اور پھر وہ صدیوں بعد آسمان سے نازل ہوگا۔

تعلیم یافتہ لوگوں کو تو مرزا قادیانی نے یہ عقلی مغالطہ دیا اور عوام کو اس دلیل سے فریب دیا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ سید المرسلین اور افضل الرسل ہیں' تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضور ﷺ تو انتقال فرما جائیں اور آپؐ کا جسد اطہر لحد میں زیر زمین دفن ہو اور حضرت مسیحؑ اس خاکی جسم کے ساتھ آسمان پر زندہ ہوں! اس طرح تو حضرت مسیحؑ ہمارے رسولؐ سے افضل قرار پاتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کو اُن کے حواریوں نے صلیب سے اتار لیا تھا' وہ زندہ تھے۔ خفیہ طور پر ان کا علاج معالجہ ہوا۔ پھر وہ چھپتے چھپاتے بیت المقدس سے نکل گئے اور کشمیر میں آ کر آباد ہوئے' وہیں طبعی طور پر ان کی وفات ہوئی اور دفن ہوئے۔ ہمارے مولویوں نے اس بات کو نہیں سمجھا اور غلط تاویلات کرتے رہے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو اُس نے خوب ہوا دی اور اس کے ذریعے سے اس نے اپنے معتقدین کو اسلاف سے کاٹ دیا۔ جب وہ لنگر کٹ گیا تو بے لنگر کا جہاز لہروں کے رحم و کرم پر ہے' وہ جس طرف چاہیں اسے لے جائیں۔ اس کے معتقدین نے سمجھ لیا کہ سب سے بڑھ کر عالم تو یہ ہے۔ اب اس نے بتدریج دعاوی شروع کیے۔ اس نے کہا کہ احادیث میں جس مسیح کے آنے کی خبر ہے وہ بذاتہٖ مسیح نہیں بلکہ مثیلِ مسیح ہے اور وہ مسیح موعود اور مثیلِ مسیح میں ہوں۔ نوبت بایں جا رسید کہ پھر وہ صاحبِ وحی نبی بن بیٹھا' ہزاروں ماننے والے اپنے گرد جمع کر لیے اور بہت سی خلقِ خدا کی گمراہی کا سبب بن گیا۔

غلام احمد پرویز نے بھی یہی طریق کار استعمال کیا۔ اس نے لونڈی غلاموں کا مسئلہ' یتیم پوتے کی وراثت' قتل مرتد اور تعددِ ازدواج جیسے مسائل کھڑے کر دیے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو قرنِ اوّل سے تا امروز متفق علیہ رہے ہیں اور اہل سنت کے تمام فقہی مکاتب کا ان پر اجماع ہے۔ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ بڑا احساس (touchy) ہے' اس نے بڑے جذباتی اور جگر سوز (pathetic) انداز میں اپنے زورِ قلم سے یتیم

پوتے کے لیے ہمدردیاں حاصل کیں۔ اس طرح قرآن کے نام پر ان تمام مجمع علیہ مسائل کے خلاف ایک محاذ بنا کر اس نے بہت سے لوگوں کو انکارِ حدیث وسنت کی ضلالت میں مبتلا کر دیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ بھی شریعتِ اسلامی کی الف' با' تا بھی جانتے ہیں' وہ اس کی بنیادوں کو جانتے ہیں' اس کے دلائل سے واقف ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے کے ''پڑھے لکھے جاہل'' تو ایک کھلی چراگاہ کی مانند ہیں کہ کوئی بھی ذہین انسان اپنی انشاء پردازی اور اپنے خاص اسلوبِ نگارش کو کام میں لا کر دھواں دار کتابیں لکھے اور اس طبقے میں سے کثیر تعداد میں لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر ایک جمعیت فراہم کر لے۔ اب خود سوچیے کہ جو لوگ قائل ہو گئے ان کے اذہان پر کیا اثرات مرتب ہوئے! ہلکے سے ہلکے انداز میں یہ تأثرات بیان کیے جائیں تو وہ یہ ہوں گے کہ ہمارے ائمہ کرام' فقہائے عظام' لائق احترام محدثین اور مفسرین بڑے بھولے بھالے تھے کہ ان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں۔ ان کی حقیقت منکشف ہوئی ہے تو اس شخص پر ہوئی ہے! یہ ہے وہ طریق کار جس سے قرآن کے نام پر اٹھنے والی دعوتوں اور تحریکوں نے منفی انداز اختیار کیا' لوگوں کو اسلاف سے بدظن کر دیا اور ان کا حال کٹی ہوئی پتنگ کا سا ہو گیا کہ ہوا جدھر چاہے اس کو لے جائے۔

دورِ حاضر کے ایک مفسرِ قرآن کی لغزش

میرے لیے اس معاملے میں بہت بڑی تشویش والی بات ہو گئی تھی کہ ایک ایسے بزرگ نے بھی یہی روش اختیار کی جو خود مفسرِ قرآن ہیں۔ ان سے میرا طویل عرصے تک قریبی تعلق و رابطہ رہا ہے' میں نے ان کی خدمت بھی کی ہے اور اُن کے فکر کی بھی۔ میں نے ان کی کتابوں کو شائع بھی کیا ہے۔ ساری عمر قرآن کے پڑھنے پڑھانے میں بتا کر آخر کار یہ ہوا کہ رجم کے متعلق انہوں نے یہ رائے دے دی کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کے لیے اسلام میں حد علیحدہ علیحدہ نہیں ہے' بلکہ شادی شدہ زانی کے لیے بھی وہی سو کوڑے ہیں جو قرآن میں آئے ہیں۔ رجم کا معاملہ تو تعزیر سے متعلق ہے' کوئی شخص غنڈہ ہو' اوّل درجے کا بدمعاش ہو' جو معاشرے میں سانڈ بنا پھرتا ہو لیکن پکڑ

میں نہ آ رہا ہو' ایسا شخص جب پکڑ میں آ جائے گا تو وہ رجم کر دیا جائے گا' ورنہ رجم با قاعدہ حد نہیں ہے' عام شادی شدہ زانی کی سزا وہی سو کوڑے ہیں جو قرآن میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگ کو معاف کرے اور انہیں توفیق دے کہ وہ اس موقف سے رجوع کریں اور توبہ کریں۔[۷]

آدمی کے سر پر جب ایک فلسفہ سوار ہو جاتا ہے تو وہ تمام احتیاطوں کو نظر انداز کر کے اپنی رائے کے حق میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جس کی اس سے توقع نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ جن کی توبہ کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی صحیح روایت موجود ہے کہ اس نے وہ توبہ کی ہے کہ اگر ایک بڑے گروہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو جائے'[۸] ان صحابی کے لیے ان بزرگ نے اپنی تحقیق کے نتیجے میں اپنی تفسیر میں ''نہایت بدخصلت غنڈا'' کا لفظ استعمال کیا (نقل کفر' کفر نباشد) یہاں تک لکھ دیا کہ ''روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کسی غزوے کے لیے نکلتے تو یہ چپکے سے دبک کر بیٹھ رہتا اور مَردوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر شریف بہو بیٹیوں کا تعاقب کرتا۔ بعض روایات سے اس تعاقب کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے کہ اس طرح تعاقب کرتا جس طرح بکرا بکریوں کا کرتا ہے''۔ آگے اس سے بھی بڑھ کر ایک نہایت غیر شائستہ بات لکھی ہے۔ آگے اپنی تحقیق ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ''آنحضرت ﷺ کو اُس کی شرارتوں کی رپورٹ ملتی رہی' لیکن چونکہ کسی صریح قانون کی گرفت میں یہ نہیں آتا تھا اس وجہ سے آپؐ نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ بالآخر یہ قانون کی گرفت میں آ گیا۔ آپؐ نے اس کو بلوا کر تیکھے انداز میں پوچھ گچھ کی۔ وہ تاڑ گیا کہ اب بات چھپانے سے نہیں چھپ سکتی اس وجہ سے اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ جب اقرار کر لیا تو آپؐ نے اس کے لیے رجم کا حکم دے دیا''۔[۹]

ان بزرگ کا ایک مستقل حلقہ ہے۔ ان کے معتقدین موجود ہیں جو انہی کی آنکھوں سے دیکھتے اور ان ہی کے کانوں سے سنتے ہیں' ان کی رائے پر اندھا اعتماد رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی حلقے سے ایک نوجوان ایسے نکلے کہ انہوں نے آگے بڑھ کر جو

جسارت کی ہے وہ بھی مسلمانوں کے کلیجے کو چھلنی کر دینے والی ہے۔ وہ اُس غامدیہ خاتون کے بارے میں کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) ''وہ چکلا چلاتی تھی'' جن کے بارے میں احادیث صحیحہ میں تفصیلات ملتی ہیں کہ وہ خود چل کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا ''حضورؐ! مجھ سے وہ خطا سرزد ہو گئی ہے جس کی سزا رجم ہے' مجھے پاک کر دیجیے' میں نہیں چاہتی کہ مجھے اس کی سزا آخرت میں ملے' مجھے اس گناہ سے یہیں پاک کر دیجیے!'' رسول اللہ ﷺ نے ہر طرح انہیں ٹالا کہ کیا کہہ رہی ہو! کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی ہو؟ انہوں نے کہا حضورؐ مجھے تو اس گناہ سے حمل ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''حمل ہے تو قصور تمہارا ہے' اس ننھی جان کا کیا قصور ہے جو تمہارے پیٹ میں ہے۔ جاؤ وضع حمل کے بعد آنا''۔ وضع حمل کے بعد وہ اللہ کی بندی پھر آ گئی۔ آپ سوچیے کہ رجم کی سزا سے زیادہ سخت سزا واقعتاً اور کوئی نہیں۔ پتھر مار مار کر ہلاک کرنا' سنگسار کرنا۔ لیکن وہ اللہ کی بندی چل کر پھر آ رہی ہے کہ ''حضور بچے کی ولادت ہو گئی ہے' مجھے پاک کر دیجیے''۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ''ابھی اس کا وجود تیرے وجود کا محتاج ہے' یہ زندہ کیسے رہے گا؟ جاؤ اس کو دودھ پلاؤ''۔ وہ اللہ کی بندی چلی گئی اور تیسری مرتبہ حاضر ہوئی تو بچہ اس کی گود میں تھا اور روٹی کا ٹکڑا بچے کے ہاتھ میں تھا۔ وہ عرض کرتی ہے کہ ''حضور ﷺ دیکھیے یہ بچہ اب اس قابل ہو گیا ہے کہ اپنی غذا حاصل کر سکتا ہے' یہ میرے دودھ کا محتاج نہیں رہا' مجھے پاک کر دیجیے''۔ میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس خاتون کے رجم کا حکم دیتے وقت کتنا بڑا پتھر اپنے دل پر رکھا ہو گا محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے' جن کی شان خود اللہ تعالیٰ نے رؤف و رحیم بیان فرمائی ہے! لیکن حضور ﷺ نے شریعت کا تقاضا پورا فرمایا اور اس خاتون کو رجم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ خاتون جس کی توبہ مثالی توبہ ہے'[۱۰] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوفِ آخرت اس کے دل پر کس طرح نقش تھا' ان بزرگ کے حلقے کے ایک صاحب اپنے ممدوح کی وکالت میں اس حد تک پہنچ گئے کہ انہوں نے اس صحابیہ خاتون کے بارے میں انتہائی شرمناک الفاظ استعمال کیے۔ انہوں نے اس واقعہ سے متعلق صحیح احادیث کو یکسر مسترد کر دیا۔

شہر لاہور میں ایک اُبھرتا ہوا فتنہ

یہی صاحب جو اَب ان بزرگ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے اور رجم کے معاملے میں ان کے سب سے بڑے ایڈووکیٹ ہونے کا ''شرف'' رکھتے ہیں' آج سے چند سال پہلے ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے چکے ہیں۔ وہ اپنے تئیں ائمہ اربعہ سے بھی خود کو بالاتر سمجھنے کے زعم میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے قرآن کے قانونِ وراثت پر ایک مضمون لکھا تھا جو اُن کے رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن کا قانونِ وراثت کسی کی سمجھ میں آج تک نہیں آیا' خاص طور پر ''کلالہ'' کے معنی تو آج تک کوئی سمجھ ہی نہیں سکا۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۲ کے آخر میں ''کلالہ'' کی وراثت کا حکم بیان ہوا ہے اور اس ضمن میں اسی سورۂ مبارکہ کی آخری آیت (۱۷۶) میں مزید وضاحت آئی ہے۔ آخر میں اس توضیح کا سبب بیان فرمایا گیا: ﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا﴾ ''اللہ (اس قانون کی) تمہارے لیے تبیین فرما رہا ہے' مبادا تم گمراہ ہو جاؤ''۔ ان صاحب کا کہنا ہے کہ اس کے باوجود اُمت چودہ صدیوں تک گمراہ رہی' کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کلالہ کا قانون کیا ہے' اب میں اس کو بیان کر رہا ہوں۔ اب یہ نوجوان رجم کے معاملے میں ان بزرگ کے ہم نوا بھی ہو گئے اور ان کے حلقۂ معتقدین میں بھی شامل ہو گئے۔ تو یہ ایک فتنہ ہے جو اِس وقت اسی شہر لاہور میں جڑیں پکڑ رہا ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب فتنہ کا آغاز ہو رہا ہوتا ہے تو توجہ نہیں ہوتی۔ جب وہ فتنہ اپنی جڑیں زمین میں اُتار لیتا ہے اور اس کی شاخیں پھیل جاتی ہیں' تب کچھ لوگ اپنی کلہاڑیاں اور تیشے لے کر آتے ہیں' لیکن اُس وقت کچھ پیش نہیں جاتی' کیونکہ وہ فتنہ ایک مضبوط تناور درخت بن چکا ہوتا ہے' اس کی شاخیں بہت دور تک پھیل چکی ہوتی ہیں اور اس کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی ہوتی ہیں۔ اسی لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس فتنہ کے متعلق آپ حضرات کو بروقت خبردار اور آگاہ کر دوں۔ اس لیے کہ یہ کام بھی قرآن کے نام پر ہو رہا ہے اور اس کے لیے جو شور اور ہنگامہ ہے وہ بھی قرآن کے حوالے سے ہے۔ یہ ایک تازہ ترین مثال آ گئی ہے۔ اس کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ

ایک معمولی مسئلہ ہے' اس پر اتنی تشویش کی ضرورت کیا ہے!(۱۱)

مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اُس نے پہلے ایک ہی مسئلہ ''رفع ونزولِ مسیح'' کا کھڑا کر کے اپنے معتقدین کو اس اجماعی مسئلے کے متعلق شک وشبہ میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کو اپنے ماضی اور اسلاف سے کاٹ دیا تھا۔ اسی مسئلہ کو منوا کر وہ درجہ بدرجہ آگے بڑھا۔ پہلے مجدّد ہونے کا دعویٰ کیا۔ جن لوگوں نے یہ دعویٰ مان لیا تو پھر ان کے حلق سے مسیح موعود' مثیلِ مسیح اور بالآخر نبی ہونے کے دعاوی تسلیم کرا لیے۔ ورنہ غور کیجیے کہ ختم نبوت اور رفع ونزولِ مسیحؑ کے سوا وہ اکثر ان چیزوں کو مانتے ہیں جو ہمارے ہاں تسلیم شدہ ہیں۔ نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کے وہ قائل ہیں' قرآن کو ماننے کے وہ مدعی ہیں' کعبہ شریف کو اُمت کا مرکز تسلیم کرنے کے وہ معترف ہیں' اپنی عبادات کے مقام کو مسجد سے موسوم کرنے پر وہ عامل ہیں۔ یہ تو ہم نے ختم نبوت کے انکار کی وجہ سے ان کی تکفیر کر کے ان کو ملت اسلامیہ سے کاٹا ہے' اور بعد ازاں ایک صدارتی آرڈیننس کی رو سے ان کے لیے اسلامی اصطلاحات کے استعمال کو بھی خلافِ قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا جان لیجیے کہ فتنہ کسی ایک یا چند مجمع علیہ مسائل کے مقابلے میں نئی اور اچھوتی بات زوردار طریقے اور مغالطہ آمیز طرزِ استدلال سے پیش کرنے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کو ہمارے معاشرے کے تعلیم یافتہ ''جہلاء'' کے حلق سے اُتروا دیا جائے تو پھر ایک ایسی چراگاہ مل جاتی ہے اور ایک ایسا میدان حاصل ہو جاتا ہے کہ اس میں شکاری جس طرح چاہیں شکار کھیلیں۔

میں یہ بات کئی بار عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ میں عالمِ دین ہونے کا ہرگز مدعی نہیں ہوں۔ میں قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور خادم ہوں۔ میں نے اُمت کے موجودہ زوال کے اسباب پر قرآن وسنت کی روشنی میں غور کیا تو جس تشخیص تک پہنچا وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ مجھے اس کی تائید الحمد للہ حضرت شیخ الہندؒ سے ان کی عمر کے آخری دَور کے عزائم سے مل گئی اور میں اسی کام میں لگا ہوا ہوں۔ مجتہد ہونا تو بہت دُور کی بات ہے' فقہ کے متعلق میرا مطالعہ محدود ہے۔ چنانچہ میں

فقہی مسائل کے متعلق استفسارات کے جواب دینے سے حتی الامکان اجتناب برتتا ہوں۔ میں نے اپنے رفقاء سے بھی کہہ رکھا ہے کہ جس فقہی مسلک پر آپ مطمئن ہیں اس پر عمل کیجیے‘ کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اپنے مسلک کے مستند علماء اور دارالافتاء سے رجوع کیجیے۔ پھر یہ کہ میری پختہ رائے ہے اور میں اس پر جازم ہوں کہ کسی مسئلہ پر اسلاف کی متفقہ رائے سے اختلاف‘ خواہ وہ کسی ایک مسئلہ ہی میں کیوں نہ ہو‘ انتہائی خطرناک ہے۔ اس طرح فتنوں کا آغاز ہوتا ہے۔ قادیانیت اور پرویزیت کے ناسور اسی طرح پیدا ہوئے۔ غور کیجیے کہ آج کل کے ہم لوگ جس نوعیت کے ہیں‘ ہماری سیرت و کردار کے جو معیارات ہیں‘ ان کے اعتبار سے کوئی مجتہدِ مطلق بن کر کھڑا ہو جائے اور خلفائے راشدین‘ ائمہ اربعہ‘ تمام محدثین اور مفسرین کی متفق علیہ اور مجمع علیہ رائے کے خلاف اپنی رائے ظاہر کر دے تو دینی اعتبار سے یہ کتنی خطرناک بات ہے! یہ تو تمام اسلاف کے فہم دین کے خلاف اظہارِ عدم اعتماد ہے۔ رجم کا مسئلہ وہ ہے کہ جس سے خوارج اور چند معتزلہ کے سوا کسی نے اختلاف نہیں کیا‘ اہل سنت کے تمام مسالک کے علاوہ سلفی مسالک کے ماننے والے بھی اس کو ’’حد‘‘ قرار دیتے ہیں‘ امام ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ بھی اسی کے قائل ہیں۔ پھر اہل تشیع کے جتنے بھی shades ہیں وہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ رجم حد ہے۔ ایسے متفق علیہ مسئلہ کے خلاف اپنا ’’اجتہاد‘‘ پیش کرنا۔ یہ ہوتا ہے دراصل کسی فتنہ کے آغاز کا سبب!

ان بزرگ کے بارے میں تو میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے پیش نظر کسی فتنہ کا آغاز ہے۔ وہ عمر کے جس اسٹیج پر ہیں وہ طبعی عمر کی قریباً آخری اسٹیج کے زمرے میں آتی ہے۔ حسرت ہوتی ہے تو اس بات پر کہ عمر کے آخری حصہ میں کوئی شخص ایسی کمائی لے کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں پہنچے۔ یہ معاملہ یقیناً حسرت ناک اور افسوس ناک ہے۔

فتنے سے بچاؤ کے لیے پانچ اصول

اب میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس دہری مشکل (dilemma) کا حل کیا ہے! ایک طرف قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کا جو بھی نتیجہ خیز‘

پائیدار اور مستقل کام ہو گا وہ قرآن کے ذریعے ہو گا۔ نبی اکرم ﷺ کا اساسی منہجِ انقلاب قرآن مجید تھا‘ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ......﴾ (البقرة:۱۵۱)

’’جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے......‘‘ آنحضور ﷺ نے دعوت و تبلیغ اور تزکیہ و تربیت کا کام کیا تو قرآن کے ذریعے کیا‘ حکمت کی تعلیم دی تو قرآن کے ذریعے دی‘ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بنیانِ مرصوص بنایا تو قرآن کے ذریعے بنایا۔ اب اگر کوئی اس طرح کا کام کرنا چاہے گا تو قرآن مجید کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ پانچوں محاذوں کے لیے کارگر اور مؤثر تلوار ایک ہی ہے اور وہ قرآن ہے۔ ماضی قریب کے ہمارے دو اکابر یعنی شیخ الہند رحمہ اللہ اور علامہ اقبال مرحوم اسی کے مؤید ہیں کہ اُمت کی اصلاح اور تجدید کا کام اگر ہو گا تو قرآن کے ذریعے ہو گا۔ جبکہ دوسری طرف قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں کا یہ حشر ہے۔ اسی وجہ سے علمائے کرام کے اندر ان کے بارے میں سوءِ ظن ہے اور وہ قرآن کے نام پر اٹھنے والی ہر دعوت اور تحریک سے خطرہ محسوس کرتے ہیں‘ اندیشوں اور خدشات میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ یہ شخص بھی کوئی نیا فتنہ کھڑا کر دے۔ میں جب اس نتیجے پر پہنچا تو اُس وقت سے مجھے علماء کرام کے اس موقف سے ایک ہمدردی پیدا ہو گئی۔ لیکن اس عقدے کا حل کیا ہے؟ اس حل کے ضمن میں میرے سامنے ایک پانچ نکاتی پروگرام ہے۔ میں اس کو اس اعتبار سے پیش کر رہا ہوں کہ لامحالہ کام تو قرآن مجید ہی کے ذریعے کرنا ہو گا‘ البتہ فتنے سے بچنے کے لیے پانچ اصول ملحوظ رکھنے ہوں گے اور پانچ اقدامات کرنے ہوں گے۔

(۱) اسلاف سے مضبوط تعلق: اسلاف کے ساتھ دلی محبت اور عقیدت و احترام کا ہمارا تعلق کسی طور سے بھی کٹنے نہ پائے۔ اس کا اس درجہ اور اس حد تک اہتمام کیا جائے کہ اگر ہمارے بزرگوں کی کتابوں میں کوئی ایسی چیز نظر آ بھی جائے جو ہمارے لیے بظاہر

قابلِ اعتراض ہوتو اوّلاً ہم اس کی بہتر سے بہتر تاؤیل کرنے کی کوشش کریں گے‘ اگر تاؤیل کی گنجائش موجود ہو۔لیکن اگر یہ ممکن نہ ہوتو ہم یہ رائے قائم کریں گے کہ یہ قابلِ اعتراض بات ان کی کتاب میں کسی اور نے شامل کردی ہوگی۔اس لیے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ اعداء نے بڑے پیمانے پر یہ کام کیے ہیں۔اس مسئلہ پر پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے بڑی تحقیق وتفتیش اور محنت وکاوش سے ’’تاریخِ تصوف‘‘ نامی کتاب لکھی تھی۔اس کتاب کا ایک باب ایسا تھا جسے کوئی سرکاری ادارہ شائع کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت دی اور میں نے اسے شائع کردیا۔اس باب کا عنوان ہے: ’’اسلامی تصوف میں غیراسلامی نظریات کی آمیزش‘‘۔میں آپ کو دعوت دوں گا کہ اس کا مطالعہ ضرور کریں۔اس میں چشتی صاحب مرحوم نے سینکڑوں مثالیں جمع کردی ہیں کہ باطل پرست فرقوں خاص طور پر باطنیہ فرقے کے لوگوں اور غالی قسم کے اہلِ تشیّع نے اہلِ سنت کے صحیح العقیدہ صوفیاءِ کرام کی کتابوں میں ایسی باتیں شامل کردی ہیں جو اُن کے مسلّمہ صحیح عقیدے اور منشاء کے خلاف ہیں۔معلوم ہوا کہ ایک سازش کے تحت ہمارے بہت سے بزرگوں کی کتابوں میں تدسیس وتحریف ہوئی ہے۔لہٰذا اسلاف میں سے کسی معتبر ومعتمد عالم اور بزرگ کی کسی کتاب میں قرآن و سنت کے اعتبار سے کوئی قابلِ اعتراض بات نظر آئے گی تو اسے تدسیس وتحریف سمجھا جائے گا۔کسی معتمد علیہ بزرگ کی توہین کرنا‘ ان کی تنقیص کرنا‘ ان کے احترام کو مجروح کرنا یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔

میں عرض کرچکا ہوں کہ اسلاف سے منقطع ہوکر انسان بے لنگر کا جہاز یا کٹی ہوئی پتنگ بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کا اسلاف کے ساتھ ادب‘ احترام‘ تعظیم‘ اعتماد اور محبت کا تعلق کمزور پڑ جاتا ہے یا منقطع ہوجاتا ہے وہ بڑی آسانی سے فتنوں کا شکار ہوجاتے ہیں۔اس بات کو ہمیشہ ایک کسوٹی (criterion) کی حیثیت سے پیشِ نظر رکھیے اور جو شخص بھی دین کی کسی خدمت کا مدعی ہو اُس کو پرکھنے‘ اس کے خلوص کو جانچنے کا ایک معیار اور اصول یہ بھی بنا لیجیے کہ اس کی صحبت میں بیٹھنے سے‘ اس کی باتیں

سننے سے‘ اس کی کتابیں پڑھنے سے آیا اَسلاف کے ساتھ دل میں احترام‘ محبت اور حسنِ ظن پیدا ہوتا ہے یا اس کے برعکس سوءِ ظن کا معاملہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ گویا اس بات کے لیے ایک اہم پہچان ہوگی کہ جو کام بھی خدمتِ دین یا قرآن کے نام پر اٹھایا گیا ہے آیا وہ صحیح رُخ پر جارہا ہے یا غلط رُخ پر۔

<u>(۲) فقہی معاملات میں اعتدال کی راہ:</u> تقلیدِ جامد اور اجتہادِ مطلق کے درمیان ہمیں ایک معتدل راستہ اختیار کرنا ہوگا۔تقلیدِ جامد سے میری مراد یہ ہے کہ بس ایک فقہ کو اس طرح پکڑ کر بیٹھے رہیں کہ اس سے ذرا بھی اِدھر یا اُدھر نہ خود ہوں گے نہ کسی کا ہونا برداشت کریں گے۔گویا انسان اس معاملہ میں اتنا زُود حس اور الرجک ہوجائے کہ کسی دوسرے فقہ کی کوئی بات سامنے آئے تو ’’من دیگرم تو دیگری‘‘ والا معاملہ ہوجائے۔ یہ درحقیقت وحدتِ اُمت کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ رہا عوام کا معاملہ تو ان کے بارے میں مَیں کہوں گا کہ اتباعِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نیت سے کسی ایک فقہ کو مستقلاً اختیار کرلیں تو مطلقاً کوئی حرج نہیں‘ بلکہ یہ ان کے لیے بہتر ہے۔ وہ تو اپنے مسلک کے معتمد علماء سے جاکر فتویٰ لیں گے‘ انہیں کیا معلوم کہ اس معاملہ میں امام ابوحنیفہ‘ امام مالک‘ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہم کے دلائل کیا ہیں! اگر معلوم ہو بھی جائے تو ان میں اتنا فہم نہیں ہوتا کہ وہ موازنہ کرسکیں کہ کس کی دلیل قوی اور اقرب الی السنہ ہے۔لہٰذا ان کے لیے عافیت اسی میں ہے کہ وہ ایک فقہ کی پیروی کریں۔اس لیے کہ اہلِ سنت کے تمام فقہی مسالک ومکاتب کا ماٴخذ کتاب وسنت ہی ہے۔جیسے میں نے ایمان کے ضمن میں عوام کے بارے میں عرض کیا تھا کہ کسی صاحب یقین وایمان کی صحبت بھی کفایت کرسکتی ہے‘ اسی طرح ان کے لیے کسی ایک فقہ کی پیروی کرنے میں مطلقاً کوئی حرج نہیں۔ البتہ ان پر یہ بات واضح کردینی ضروری ہے کہ اہلِ سنت کے تمام مسالک مبنی بر کتاب وسنت ہیں‘ تاکہ دوسرے مسلک کے پیروکاروں کے متعلق ان کے دلوں میں غیریت کا احساس بالکل پیدا نہ ہو۔

رہا ان حضرات کا معاملہ جو دین کے خادم ہیں‘ جو میدان میں آکر دین کی خدمت

کر رہے ہیں' جن کے سامنے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور احیائے دین کی منزل ہے' انہیں تو یقیناً اس تقلیدِ جامد سے نکلنا پڑے گا۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ جب ہم اہل سنت کے تمام مسالک کو اپنا مشترکہ اثاثہ اور علمی ورثہ سمجھتے ہیں' ائمہ اربعہ کو اہل سنت کے امام مانتے ہیں اور امام بخاریؒ کی صحیح الجامع کو اصحّ الکُتبِ بعدَ کِتاب اللّٰہ تسلیم کرتے ہیں تو کم از کم ان پانچ دائروں کی حد تک تو اپنے قلب و ذہن کو کشادہ اور وسیع کیا جائے۔

مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی تقریر کے حوالے سے' جو ''وحدتِ اُمت'' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے' حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے قرآن کی تبلیغ و دعوت کے بارے میں عزائم کا ذکر کیا جا چکا ہے جن کا اظہار حضرت شیخ الہندؒ نے اسارتِ مالٹا سے واپسی کے بعد دارالعلوم دیوبند میں علماء کے ایک اجتماع میں کیا تھا۔ اسی کتاب میں بیہقیٔ وقت مولانا انور شاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا ایک ایسا واقعہ مفتی صاحبؒ نے بیان کیا ہے کہ اسے آبِ زر سے لکھا جائے تو بھی اس کی عظمت کا حق ادا نہیں ہوتا اور اس کو جس قدر عام کیا جائے اسی قدر اِن شاء اللہ ہمارے یہاں فقہی معاملات میں جو تشتت و افتراق ہے' اس میں بڑی حد تک اعتدال آ سکتا ہے۔ مفتی صاحب راوی ہیں کہ حضرت انور شاہؒ ایک موقع پر بہت مغموم بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا: حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا: ''ہاں! ٹھیک ہی ہے' میاں' مزاج کیا پوچھتے ہو' عمر ضائع کر دی''۔ مفتی صاحبؒ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں' دین کی اشاعت میں گزری ہے۔ آپ کے شاگرد علماء ہیں' مشاہیر ہیں۔ اگر آپ کی عمر ضائع ہوئی تو کس کی عمر کام میں لگی؟ فرمایا: ''میں تمہیں صحیح کہتا ہوں کہ عمر ضائع کر دی!'' میں نے عرض کیا: حضرت بات کیا ہے؟ فرمایا:

''ہماری عمر کا' ہماری تقریروں کا' ہماری ساری کدوکاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں' امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا' تقریروں کا اور علمی زندگی کا! اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری

ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا' وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعیؒ' امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں' کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب محتمل الخطأ (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو خطأ محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں' اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں' تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں''۔

پھر فرمایا:

''ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا' اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہو سکتا' دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح' یا یہ کہ یہ صحیح ہے' لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو' اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی' قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترکِ رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق تھی یا بالسّر حق تھی' برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا''۔

مفتی صاحب کہتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مزید الفاظ یہ تھے:

''اللہ تعالیٰ شافعیؒ کو رسوا کرے گا نہ ابوحنیفہؒ کو نہ مالکؒ کو اور نہ احمد بن حنبلؒ کو' جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے' جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے' جنہوں نے نورِ ہدایت چار سو پھیلایا ہے' جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں' اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس' یہ نہیں ہوگا''۔

وقت کی اہم اور شدید ترین ضرورت ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کا قول اور حضرت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے ان اقوال کو کم از کم دیوبندی اور تھانوی حلقوں میں جس

قدر ممکن ہو پہنچایا جائے‘ تاکہ جو اِن حلقوں کے متوسلین اور عقیدت مند ہیں ان کی تو آنکھیں کھلیں کہ ہمارے یہ دونہایت ہی قابلِ اعتماد متقی اور متدیّن اکابر اپنی عمر کے آخری دَور میں پہنچ کر اپنے تجربات کی روشنی میں کن نتائج تک پہنچے تھے! علمی اعتبار سے اور جہادِ حریت کے حوالے سے جہاں شیخ الہندؒ کا بلند ترین مقام سمجھا جاتا ہے وہاں حضرت انور شاہ صاحبؒ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ محدث اور فقیہہ ہونے کے اعتبار سے وہ چودھویں صدی کی شخصیت نہیں ہیں بلکہ وہ تو پرانے دَور کی علمی شخصیتوں کے ہم پلہ شخصیت ہیں۔ انہیں بیہقیؒ وقت کہا جاتا ہے۔ ان بزرگوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں جو باتیں کہی ہیں‘ کاش ان کے متوسلین تو کم ازکم ان پر غور کریں‘ سوچیں اور اپنے طرزِ عمل میں ان اکابر کی باتوں کے پیشِ نظر خوشگوار اور صحت مند تبدیلی لانے کی فکر کریں! ان اقوال کی شہادت دینے والے بزرگ مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ ہیں‘ جن کے ثقہ راوی ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے خیالات کے پیشِ نظر تقلید جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین ایک معتدل راستہ نکالنا ہوگا‘ خاص طور پر اُن حضرات کو جو علمی میدان میں خدمتِ دین اور خدمتِ قرآن میں لگے ہوئے ہیں۔ میں اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ میں نیم مقلد ہوں۔ یعنی میں مقلد ہوں پانچ کا‘ صرف ایک کا نہیں۔ چار تو اہل سنت کے متفق علیہ ائمہؒ ہیں‘ اور پانچویں امام بخاریؒ‘ جن کی کتاب کے متعلق سب مانتے ہیں کہ ''اصح الکتب بعد کتاب اللّٰہ''۔ میں ان پانچ کے دائرے کے اندر اندر رہنے میں اپنے لیے عافیت سمجھتا ہوں۔ اللہ کرے کہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ کسی ایسی عظیم شخصیت کو کھڑا کر دے جس کے تقویٰ‘ تدین‘ فہم دین‘ اصابت رائے اور خلوص و اخلاص پر اُمت کے بڑے حصے بالخصوص علمائے حق کی اکثریت کا اجماع ہو جائے تو وہ تمام فقہی مسالک میں عمیق غور و فکر کے بعد پوری للّٰہیت اور خدا ترسی کے ساتھ اُمت کو ایک فقہی مسلک پر مجتمع کر دے۔ ایسی شخصیت کا یہ مقام ہوگا کہ وہ کسی مسئلہ کے متعلق دین کے دائرے کے اندر اجتہادِ مطلق کر سکے۔ اس دَور میں ہم جیسے کم علم اس طرح کی حرکت کریں گے تو

دین کے خلاف بغاوت اور ایک بہت بڑے فتنے کا آغاز کرنے کا باعث بنیں گے۔ چنانچہ عافیت اسی میں ہے کہ رہیں اس دائرے کے اندر‘ لیکن یہ نہیں کہ بس ایک ہی فقہ کا دائرہ ہو۔ عوام کا معاملہ اور ہے‘ وہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کریں اور روز مرّہ کے مسائل میں اپنے مسلک کے معتمد علماء کی طرف رجوع کریں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہی ہدایت میں نے تنظیم اسلامی کے رفقاء کو دی ہے۔ فقہی مسائل کے بارے میں مَیں اپنی رائے کے اظہار سے بھی حتی الامکان گریز کرتا ہوں۔ البتہ میرا ایک مزاج ہے اور میں اسے چھپانا نہیں چاہتا کہ میں مقلد محض نہیں ہوں‘ میں نیم مقلد ہوں۔ میں ان پانچوں ائمہ کا مقلد ہوں اور ان پانچوں کے دائروں سے باہر جانے کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری مشترک متاع ہے۔ ان دائروں کے اندر اندر جس کی رائے کو بھی اقرب الی السنۃ اور اقرب الی الصواب سمجھتا ہوں‘ اسے ترجیح دیتا ہوں۔

(۳) دعوت الی القرآن کے چند اصول: اس پروگرام کی تیسری شق دعوت رجوع الی القرآن سے متعلق ہے۔ میں نے اشارہ کیا تھا کہ جب میں نے اس دعوت کا آغاز کیا تھا تو چند اصول پلّے باندھ لیے تھے۔ کام کے ساتھ ساتھ بفضلہٖ تعالیٰ ان اصولوں پر وثوق حاصل ہوتا رہا اور اللہ کی توفیق سے چند اور اصول بھی سامنے آتے رہے‘ جن کو میں نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ وہ اہم اصول پیش کیے دیتا ہوں۔

دعوت رجوع الی القرآن کا ایک تعلق احکام سے ہے۔ اس ضمن میں میرا ایک مستقل اور اٹل موقف رہا ہے اور وہ بالکل منطقی ہے کہ اس کا سارا دارومدار اور تعلق نبی اکرم ﷺ کے عمل سے ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ آنحضور ﷺ سے جتنے زیادہ قریب تھے‘ اسی نسبت سے سب سے زیادہ استفادہ انہوں نے کیا۔ یہ تھے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ نمبر دو پر تابعین ہیں جو صحابہ کرامؓ کے تربیت وصحبت یافتہ تھے اور نمبر تین پر آتے ہیں تبع تابعین۔ یعنی تابعین سے مستفیض و مستفید ہونے والے اور تربیت پانے والے حضرات رحمۃ اللہ علیہم اجمعین — اسی کی وضاحت ہے جو نبی اکرم ﷺ کے ایک ارشاد میں ہمیں ان الفاظ میں ملتی ہے: ((خَیْرُ اُمَّتِیْ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ ثُمَّ

الَّذِیْنَ یَلُوْنَھُمْ))[۱۲] جو جتنا دُور تھا اس کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے‘ جو جتنا قریب ہے وہ اتنا ہی قابل اعتماد ہے۔ اس نے اگر حضور ﷺ کو نہیں دیکھا تو حضور ﷺ کے تربیت یافتہ لوگوں کو دیکھا ہے‘ ان کی صحبت اٹھائی ہے۔ اگر ان کو نہیں دیکھا تو ان کے تربیت یافتہ لوگوں کو دیکھا ہے‘ ان سے فیض اور افادہ حاصل کیا ہے۔ تو اُمت کا یہ جو تواترِ عمل ہے یہ سنت کو معلوم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ لہٰذا احکامِ دین کا جہاں تک تعلق ہے‘ اس میں کوئی نئی بات کہنا فتنہ اور فساد کی اصل جڑ ہے۔ اس میں تو کوشش ہو کہ پیچھے سے پیچھے جاؤ‘ حتیٰ کہ پہنچ جاؤ محمدٌ رسول اللہ ﷺ تک۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی ست!

جہاں تک دین پر عمل کا تعلق ہے تو میں عرض کر دوں کہ قرآن حکیم کی وہ آیات ایک پارے کے بقدر بھی نہیں بنیں گی جو عملی طور پر احکام دین سے متعلق ہیں‘ جن سے فقہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے۔ اصل میں عمل کا سارا دار و مدار سنتِ رسولؐ پر ہے۔ قرآن مجید میں نماز کی کتنی تاکید ہے۔ اسے ہر وہ شخص جانتا ہے جس کا دین سے ذرا بھی تعلق ہے‘ بلکہ اس بات کو تو وہ بھی جانتے ہیں جن کا دین سے عملی تعلق منقطع ہے۔ لیکن نماز کی ہیئت اور ترتیب کہاں سے ملے گی؟ اوقات کہاں سے ملیں گے؟ قرآن میں اشارات ہیں‘ لیکن نماز سے متعلق پورا نظام سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ملے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ))[۱۳] ”نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھتے ہو“۔ چنانچہ جہاں تک احکام دین اور فقہی مسائل کا تعلق ہے وہ سنت میں ملیں گے۔ سنت ہی احکامِ قرآن کی عملی تفسیر ہے‘ اسی سے استنباط ہوگا‘ استشہاد ہوگا‘ حتیٰ کہ اجتہاد ہوگا۔ لہٰذا اس معاملہ میں پیچھے سے پیچھے جایئے‘ آگے مت جایئے! احکام کے بارے میں ائمۂ مجتہدین اور محدثین کے دائرے سے باہر قدم نہ نکالیے۔

دوسرا یہ اصول میں نے گرہ میں باندھ رکھا ہے کہ قرآن اور احادیثِ صحیحہ میں

جو معجزات‘ خرقِ عادت اور محیر العقول برکات و واقعات مذکور ہیں‘ ان سب پر ہمیں حرف بہ حرف (literally) ایمان لانا ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور وہ جس ربّ العالمین اور خالقِ کائنات کا انسان سے تعارف کراتا ہے وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کی شان کا بھی حامل ہے‘ وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ بھی ہے‘ اور صرف وہی اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ اور اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں مَیں کسی تاویل کا روادار نہیں۔ ان کو جوں کا توں قبول کرنا میں ایمان کا لازمی جزو سمجھتا ہوں۔

تیسری بات یہ کہ قرآن مجید میں جن انبیاء و رُسل علیہم السلام اور جن اقوام و ملل کا ذکر ہے وہ بطورِ تذکیر اور بطورِ عبرت ہے۔ قرآن تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے کہ جس میں تمام معلومات جمع کر دی گئی ہوں۔ اس ضمن میں میری رائے ہے کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ علم‘ جستجو‘ تحقیق اور معلومات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا آ رہا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا اس معاملے میں اگر ہمارے متقدمین علماء‘ محققین اور مفسرین کی آراء موجودہ تحقیقات و معلومات اور فراہم شدہ data سے مطابقت نہ رکھتی ہوں تو یہ بالکل فطری بات ہے‘ اس سے متوحش اور تشویش میں مبتلا ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ جوں جوں تحقیقات و معلومات کا دائرہ وسیع ہوگا اس کے نتیجہ میں قرآن مجید کی حقانیت مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی‘ قرآن میں جو اشارات ہیں وہ کھلتے چلے جائیں گے اور جو اجمال ہے وہ واضح ہوتا چلا جائے گا۔

اسی طرح قرآن حکیم سائنس کی کتاب بھی نہیں ہے۔ اصلاً یہ کتابِ ہدایت ہے‘ ھُدًی لِّلنَّاسِ ہے‘ لیکن یہ خالقِ کائنات کا کلام ہے‘ لہٰذا اس میں سائنسی مظاہر (scientific phenomena) کی طرف جابجا اشارے کیے گئے ہیں۔ کوئی اشارہ جیالوجی سے متعلق ہے‘ کوئی چیز علم فلکیات کے میدان کی ہے‘ کوئی چیز بیالوجی سے تعلق رکھتی ہے تو کوئی چیز فزیالوجی اور کوئی ایمبریالوجی (جنینیات) کے دائرے کی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآنِ مجید میں علم الجنین کا کتنی بار حوالہ آیا ہے اور رحم مادر میں جنین کے مختلف مراحل بیان ہوئے ہیں کہ وہ پہلے نُطفہ ہوتا ہے‘ پھر عَلَقہ بنتا ہے‘ پھر مُضغہ

کی صورت اختیار کرتا ہے‘ پھر عِظام (ہڈیوں) کا مرحلہ آتا ہے‘ پھر ان ہڈیوں پر لحم (گوشت) چڑھتا ہے‘ پھر وہ زندہ انسان کی صورت میں رحم مادر سے تولّد ہو جاتا ہے۔ الغرض جتنے بھی سائنٹیفک پہلو اور گوشے ہیں‘ ان سب کے متعلق قرآن مجید میں اشارات موجود ہیں۔ ان کے متعلق جدید تحقیقات کی روشنی میں اگر یہ رائے دی جائے کہ ہمارے متقدمین علماء و مفسرین ان امور کو سمجھ نہ پائے تو یہ کوئی اچنبھے اور حیرانی والی بات نہیں۔ ان کے زمانے میں سائنس کا علم جس سٹیج پر تھا ظاہر بات ہے کہ وہ اسی کے مطابق قرآن مجید کے اشارات کی توجیہہ و تاویل اور تشریح و توضیح کرتے رہے۔ ان کے دَور تک سائنسی معلومات کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس سے آگے وہ کیسے جاتے؟ کسی کے لیے بھی اپنے دور کی موجود معلومات کے دائرے سے آگے جانا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ سات آسمانوں کی انہوں نے جو تعبیر کی‘ برجوں کی انہوں نے جو توجیہہ کی‘ ﴿كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ﴾ (الانبیاء) کی جو تعبیر کی یا جو بھی انہوں نے ﴿سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ (الجاثیة:۱۳) کا مفہوم سمجھا‘ ان سب کو انہوں نے اُس وقت کے فراہم شدہ data کی روشنی میں سمجھا اور بیان کیا۔ سائنس نے ہمارے دور میں جو ترقی کی ہے اور جدید تحقیقات کے نتیجے میں جو انکشافات کیے ہیں ان کی روشنی میں اب ان آیات کی جو تعبیر اور توجیہہ کی جائے گی‘ جو مفہوم بیان کیا جائے گا تو یہ بات غلط نہیں ہوگی اور نہ اس سے ہمارے متقدمین کی کوئی توہین یا تنقیص ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ مستقبل میں چند ایسے حقائق سامنے آئیں جو موجودہ تحقیقات سے بھی آگے کے ہوں۔ اس طرح قرآن کے عجائبات بھی مزید واضح ہوتے رہیں گے۔

اسی طرح قرآن حکیم تخلیق کائنات کے جو اَدوار اور تخلیق آدم کے جو مدارج بیان کرتا ہے‘ پھر آفاق و انفس سے توحید باری تعالیٰ کے متعلق جو بدیہی اور فطری استدلال پیش کرتا ہے‘ ان سب کو جدید دور کے مسلّمہ اکتشافات‘ تجربات اور سائنسی حقائق کی روشنی میں موجودہ تعلیم یافتہ طبقے کی تفہیم و تعلیم کے لیے جدید اصطلاحات کے حوالے سے بیان کرنا ہوگا۔ یہی ابلاغ کا تقاضا ہے‘ لہٰذا اس کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح موجودہ دَور کے تمام مادہ پرستانہ نظریات‘ ملحدانہ افکار اور طاغوتی نظام ہائے زندگی کے مقابلے میں قرآن کی انقلابی دعوتِ توحید پر ایمان لانے اور پھر اس ایمان و ایقان کے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق جو مقتضیات‘ مضمرات‘ مطالبات اور توحید کی جو فروع (corollaries) ہیں‘ اس کے جو صریحی و منطقی اور بدیہی نتائج ہیں‘ ان کو موجودہ دَور کی اصطلاحات کے حوالے سے پیش کرنا ضروری ہے۔ یعنی اوّلاً تمام بنی نوعِ انسان کی اللہ کے بندے اور آدم کی اولاد ہونے کے ناطے کامل مساوات۔ اللہ کے نزدیک اکرم و اشرف وہ ہے جو اللہ کا سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ (الحجرات:۱۳) —— ثانیاً انسان کی ہر نوع کی حاکمیتِ مطلقہ کی نفی۔ یعنی ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ کا اثبات اور اس کی توضیح و تشریح اور حاکمیت کی جگہ خلافت کا تصور۔ ثالثاً ملکیت مطلقہ کی نفی اور ﴿لِلّٰهِ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الْاَرْضِ﴾ کی تشریح اور ملکیت مطلقہ کی جگہ امانت کا تصور۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قرآن کی عظمت کے بارے میں جو ایک طویل حدیث آئی ہے اس میں وارد جو الفاظ ہیں ((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِىْ عَجَائِبُهٗ))(۱۴) یعنی ”علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہوسکیں گے‘ نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات یعنی نئے نئے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا“ تو میرے نزدیک اس کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ دنیا میں قرآن مجید‘ فرقان حمید ہی اس ہدایت کی حامل کتاب ہے جو ہر دور کے مشرکانہ‘ خدانا آشنا اور ملحدانہ نظام ہائے زندگی کے مقابلے میں انسان کی رہنمائی اور فلاح کے لیے توحید پر مبنی‘ ہر نوع کے استحصال‘ تعدّی اور استبداد سے پاک اجتماعی نظامِ عدل و قسط پیش کرتا ہے۔ اسی نظام کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد ہی اقامتِ دین کی جدوجہد ہے۔ اور میری پختہ رائے ہے کہ جب تک موجودہ اصطلاحات کے حوالے سے دینِ حق کو دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا نہ دعوت و تبلیغ کا کما حقہ‘ حق ادا ہوگا‘ نہ

ابطالِ باطل ہو گا نہ احقاقِ حق — چنانچہ میں اپنی دعوت میں ان تمام امور کو ملحوظ رکھتا ہوں اور اِن شاء اللہ رکھوں گا۔ میرے نزدیک اسی طرزِ فکر وعمل کا نام ہے حکمتِ دین!

میں نے آج یہ باتیں آپ کے سامنے قدرے تفصیل سے مربوط طریقے سے بیان کی ہیں۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں جو کچھ بھی اپنی استعداد و استطاعت کے مطابق کام کر رہا ہوں اور دن رات جس کام اور جس دعوت کی دُھن مجھ پر مسلط ہے وہ بحمد اللہ انہی اصولوں کے تحت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے خزانہ فضل سے مزید توفیق و ہمت دے کہ اُس کی کتابِ عزیز کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکوں اور اس کے علوم و معارف کی توضیح وتشریح کی سعادت پا سکوں اور اسی حال میں آخرت کے لیے رختِ سفر باندھوں۔

(۴) علماءِ کرام سے ربط وضبط: چوتھا نکتہ یہ ہے کہ اس دورِ فتن میں ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (الروم:۴۱) کا نقشہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدانا آشنا اور ملحدانہ نظریات وافکار' تہذیب وتمدن اور نظام ہائے زندگی کے باعث پوری دنیا میں فساد رونما ہو چکا ہے' انسانیت تیزی کے ساتھ ہلاکت خیزی کی طرف چلی جا رہی ہے۔ اُمتِ مسلمہ جو امر بالمعروف' نہی عن المنکر' دعوت الی اللہ اور دعوت الی الخیر کے لیے برپا کی گئی تھی وہ خود خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی ہے۔ لہٰذا اس دور میں کرنے کا اصل کام ہے نوعِ انسانی کو دعوتِ توحید و ایمان دینا اور توحید علمی و عملی کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد کرنا۔ اسی کا نام تکبیرِ ربّ ہے' اسی کا نام اظہار دین الحق علی الدین کلہٖ ہے۔

اب جو بھی دعوت اور تحریک اس مقصد کو لے کر اٹھے اس کے سربراہ اور رفقاء کو اپنے اوپر لازم کر لینا چاہیے کہ وہ علماءِ حق سے ربط وضبط رکھیں گے' اپنے اوقات و مصروفیات میں سے وقت نکال کر ان کی خدمت میں حاضری دیں گے اور ان سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ معلوم کریں گے کہ ان کے مغالطے کیا ہیں اور ان کے خدشات کی نوعیت کیا ہے! بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہیں کوئی غلط بات پہنچا دی

جاتی ہے' ہمارے موقف کے متعلق انہیں مغالطے دے دیے جاتے ہیں اور وہ اپنی نیک نیتی سے راویوں پر اعتماد کر کے ان غلط خبروں کو درست مان لیتے ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص خود نیک نیت ہوتا ہے وہ دوسروں کے ساتھ بھی حسنِ ظن کا معاملہ کرتا ہے۔

میں نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے بیعت کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے کچھ عرصہ قبل اس کے خلاف اخبارات میں تین علماء کا فتویٰ شائع ہوا تھا' جس میں بیعت کے طریقہ کار کو کسی دینی ہیئتِ اجتماعی کی تشکیل کے لیے غلط قرار دیا گیا تھا۔ اس ضمن میں جب میں نے ایک عالمِ دین سے رجوع کیا' ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے بتایا کہ مجھے تو وہ بیان دکھایا ہی نہیں گیا' مجھے تو فلاں صاحب نے ٹیلی فون پر کچھ بتایا تھا' اس میں بیعت کا مسئلہ تھا ہی نہیں' انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اس پر آپ کا نام بھی دے دیا جائے؟ انہوں نے جن صاحب کا نام لیا وہ بھی ایک بڑی مذہبی شخصیت ہیں' لہٰذا انہوں نے نیک نیتی سے سمجھا کہ اتنی بڑی شخصیت جو بات بتا رہی ہے وہ صحیح ہو گی' اس لیے انہوں نے اپنے نام کی شمولیت کی منظوری دے دی۔ چنانچہ ان کی خدمت میں حاضری کا یہ فائدہ ہوا کہ پھر ان بزرگ نے اپنا تردیدی بیان اخبارات کو جاری کرایا کہ ''میرے نزدیک دینی ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے بیعت کا طریق کار اختیار کرنے میں شرعی نقطۂ نظر سے قطعاً کوئی قباحت نہیں ہے''۔ یہ بات ان بزرگ کی نیک نفسی اور خلوص کی دلیل ہے۔ اگر میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوا ہوتا تو یہ غلط بات آگے بڑھتی اور اس کے نہ معلوم کہاں کہاں اور کیا کیا اثرات مترتب ہوتے۔ لیکن ربط وضبط کے ذریعہ سے مغالطوں اور سوءِ ظن کو اگر بالکل نہیں تو بہت حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔

میں ان صاحب کے پاس بھی گیا جنہوں نے ٹیلی فون پر ان عالمِ دین سے گفتگو کی تھی۔ ان سے تبادلۂ خیال کیا اور افہام وتفہیم کی کوشش بھی کی' جو اگرچہ نتیجہ خیز نہیں ہوئی لیکن بہرحال میں نے دلائل کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر اُن کے سامنے رکھ دیا۔

(۵) علماءِ حق کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش: پانچویں اور آخری نکتے کے متعلق میں پوری دیانت داری سے عرض کرتا ہوں کہ میرا موقف یہ ہے کہ ہر وہ دعوت جو اقامت دین کو

اپنا ہدف بنا کر کھڑی ہوئی ہو' اس کے لیے صرف وقتی تدبیر کے طور پر نہیں' بلکہ قلب کی گہرائیوں سے لازم ہے کہ علمائے حق کا اعتماد کرنے کے لیے بھرپور کوشش کرے۔ میں دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں کہ کوئی بھی شخص اُس وقت تک اُمت کے اندر دین کا کوئی مؤثر کام نہیں کر سکے گا جب تک وہ ان علماء کا اعتماد حاصل نہ کرے جن کے متعلق اسے یہ یقین ہو کہ ان میں للّٰہیت ہے' خلوص و اخلاص ہے' تقویٰ ہے اور ان میں انانیت و نفسانیت نہیں ہے۔ چھوڑ دیجیے ان کو جو علمائے سوء ہیں' جن کو اپنی گدیوں کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے' جنہیں یہ اندیشہ ہر وقت پریشان کیے رکھتا ہے کہ ہمارے گلے کی بھیڑیں ٹوٹ کر کسی اور کے گلے میں شامل نہ ہو جائیں۔ جہاں تک ہمارے علمائے حقانی کے اندیشوں اور خدشات کا تعلق ہے' اس کے اسباب تفصیل سے بیان کیے جا چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب بھی ان کے سامنے ان کے پورے احترام و ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا موقف پیش کیا جائے گا اور ان سے مستقل و مسلسل ربط و ضبط قائم رکھا جائے گا تو اِن شاء اللہ العزیز اُن کی تائید اور ان کی دعائیں ضرور حاصل ہوں گی۔

حرفِ آخر

آخر میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام پہلی قرآن کانفرنس ۱۹۷۳ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اُس وقت میں نے کہا تھا کہ ہمارے یہاں ''قران السعدین'' اُس ساعت اور گھڑی کو کہا جاتا ہے جب دو سعید چیزیں جمع ہو جائیں' لیکن یہاں تو بفضلہٖ ''قران السعداء'' ہو گیا ہے' اس اعتبار سے کہ اس پہلی کانفرنس میں عظیم شخصیتوں کے جانشین موجود تھے۔ وہاں ایک طرف مولانا عبدالرحمٰن اشرفی صاحب تشریف فرما تھے جو مفتی محمد حسن رحمۃ اللہ علیہ بانی جامعہ اشرفیہ کے صاحبزادے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے سٹیج پر مولانا عبید اللہ انور صاحب تشریف فرما تھے جو مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے اور جانشین ہیں۔ پھر اس میں مولانا محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ تشریف لائے تھے جو علمائے دار العلوم دیو بند کی جانشینی کا اعزاز اور شرف رکھتے تھے۔ میری تو ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ جملہ مکاتب فکر کے علماء کو ایک

سٹیج پر قرآن کا پیغام خلقِ خدا تک پہنچانے کے لیے جمع کیا جائے۔ چنانچہ ہماری قرآن کانفرنسوں میں جو اہم دینی و علمی شخصیتیں شریک ہوتی رہی ہیں ان میں سے چند نام پیش کرتا ہوں۔ مولانا شمس الحق افغانی' نامور عالم و محدث حضرت مولانا محمد گوندلوی' مولانا مفتی محمد حسین نعیمی' مولانا مفتی تقی عثمانی (جسٹس شریعت کورٹ)' مولانا ابوبکر غزنوی' مولانا داؤد غزنوی' پروفیسر یوسف سلیم چشتی' مولانا محمد طاسین' ڈاکٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن (چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل) اپنے ملک کے علماء کرام و دانشوروں کے علاوہ بھارت کے کئی نامور علمائے کرام اور اہل دانش و بینش حضرات قرآن کانفرنسوں میں شرکت کر کے اپنے بیش بہا خیالات سے حاضرین کو مستفیض فرما چکے ہیں۔ مولانا حامد میاں مدظلہ خلیفۂ مجاز حضرت مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ خود تشریف نہیں لا سکے لیکن ہر کانفرنس کے لیے انہوں نے باہتمام اپنا وقیع مقالہ ارسال فرمایا۔ اس وقت جلدی میں جو نام نوکِ زبان پر آئے ان کو بیان کر دیا گیا ہے' ورنہ الحمد للہ ہر کانفرنس اس لحاظ سے بے مثال تھی کہ قرآن مجید کے پیغام کے لیے ہر مسلک کے علماء نے تعاون فرمایا۔ میرے ساتھی جانتے ہیں کہ رجم کے سلسلہ میں جن بزرگ کا ذکر ہوا ہے' اُس وقت میرا ان سے بڑے قرب کا معاملہ رہا تھا۔ تو اُس وقت انہوں نے میرے اس طرزِ عمل پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''ان مولویوں کو سر پر بٹھا کر کیا لینا ہے؟ ان مولویوں کی تو ہمیں تردید کرنی ہے''۔ لیکن اللہ کا فضل یہ ہے کہ میرا مزاج یہ نہیں ہے۔ میں علماء کرام کی خدمت میں مؤدبانہ حاضر ہوا کرتا ہوں اور میں تو یہ سمجھا کرتا ہوں کہ میرے لیے تحفظ کی ایک چیز یہ ہے کہ میں عالمِ دین نہیں ہوں' محض قرآن مجید کا ایک طالب علم اور ادنیٰ خادم ہوں۔ ورنہ اگر کہیں مجھے بھی کوئی غرۂ علمی ہو گیا ہوتا' میں بھی کسی زعم میں مبتلا ہو گیا ہوتا تو اس عُجب کی وجہ سے میرے دماغ میں بھی خنّاس پیدا ہو گیا ہوتا جو میرے لیے آخرت میں ہلاکت کا سبب بن جاتا۔ میں صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ سے کسی عُجب میں مبتلا ہونے سے پناہ کا طالب رہتا ہوں۔

''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' نامی کتابچہ میں نے ۱۹۶۶ء میں لکھا تھا۔

اس کا ایک نسخہ میں نے ۱۹۷۰ء میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا جبکہ وہ مسجد نبویؐ میں معتکف تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اس کو بنظرِ غائر ملاحظہ فرما لیجیے' کیونکہ میں اسے بڑے پیمانے پر پھیلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے آپ کی رہنمائی درکار ہے' اگر کوئی غلطی ہو تو نشان دہی فرما دیں' میں اس کو درست کر لوں گا۔ مولانا نے از راہِ شفقت اور از راہِ تعاون علی البر میری درخواست قبول فرمائی' اعتکاف کی حالت میں مسجد نبویؐ میں اسے پڑھا اور صرف ایک جملہ میں ترمیم فرما دی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس ترمیم سے وہ جملہ مزید نکھر آیا' میرا جو مفہوم تھا وہ اس ترمیم سے مزید واضح ہو گیا اور میرے جملے سے جس مغالطے کے پیدا ہونے کا امکان تھا بحمد اللہ مولانا نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ کی ترمیم سے اس کا احتمال ختم ہو گیا۔ تو اللہ کے فضل و کرم سے میرا مزاج تو یہ ہے' اور آج سے نہیں ابتدا سے ہے۔ الحمد للہ میں عُجب اور تکبر سے بچنے کی شعوری طور پر اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتا رہتا ہوں۔ نبی اکرم ﷺ نے تین مہلکات میں سے اس عُجب کو شدید ترین باعثِ ہلاکت قرار دیا ہے۔ آپ سے بھی درخواست ہے کہ میرے حق میں دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے مجھے بچائے رکھے۔

کل رمضان المبارک کی ۲۹ ویں شب کو جامع القرآن' قرآن اکیڈمی میں ہمارا دورۂ ترجمۂ قرآن ختم ہوا ہے۔ یہ کام اللہ تعالیٰ کی توفیق و نصرت ہی سے تکمیل کو پہنچا ہے۔ اس سے مجھے ایک امید پیدا ہوئی ہے کہ یہ کام اِن شاء اللہ العزیز مقبول ہو گا اور دوسرے لوگ بھی اس کا اہتمام کریں گے۔ جیسے ہم نے ''قرآن کانفرنس'' کے سلسلہ کا آغاز کیا تو وہ اتنا عام ہو گیا کہ مختلف دینی حلقوں کی طرف سے قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو مسلسل جاری ہے۔ ہمیں اس پر خوشی ہے۔ ہم نے کچھ اور نئے کام شروع کیے تو اس نہج پر بھی کام شروع ہو گیا۔ اللہ سب کو توفیق دے اور سب کے کاموں میں برکت دے' ان کو دین کے لیے سازگار بنائے' ایک کام کے لیے بیسیوں ادارے ہوں' سینکڑوں اشخاص ہوں' لیکن آپس میں ٹکراؤ اور تصادم نہ ہو تو یہ بڑی نیک فال ہے۔ میری معلومات کی حد تک رمضان المبارک میں تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ

قرآن پہلی مرتبہ پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے۔ ہمارے یہاں تراویح تو ہر مسجد میں ہوتی ہے اور جن لوگوں کو توفیق ملتی ہے اور جن میں ذوق و شوق ہے وہ تراویح پڑھتے ہیں۔ اگر ہر چار رکعات تراویح سے قبل ان میں پڑھے جانے والے قرآن مجید کا حاضرین کو صرف ترجمہ سنا دیا جائے تو میرا اندازہ ہے کہ شرکاء چاہے عربی سے بالکل ہی ناواقف ہوں پڑھے جانے والے قرآن مجید کے کم از کم پچیس فیصد حصے کے مفہوم کو سمجھتے چلے جائیں گے۔ اس لیے کہ ترجمہ کے ذریعے قرآنی الفاظ کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی قائم ہو جاتی ہے اور یہ ذہنی رابطہ معنی اور مفہوم کو سمجھنے میں ممد ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے اور بڑی بڑی مساجد میں بڑے پیمانے پر ہمارے علماء کرام اس کام کی طرف توجہ دیں تو میرے نزدیک یہ بہت بڑا break through ہو جائے گا۔

ہمارے بعض احباب نے کل ختم قرآن کے موقع پر اپنے تأثرات کا اظہار فرمایا کہ یہ کام جتنا کٹھن نظر آ رہا تھا' اتنا کٹھن ثابت نہیں ہوا۔ سینکڑوں کی تعداد میں جن لوگوں نے شرکت کی ہے' ان میں اکثر وہ حضرات بھی تھے جو رات دو بجے تک اس پروگرام میں شریک رہے اور دن کو انہوں نے اپنے معمولات کے مطابق کام بھی پورے کیے۔ اور الحمد للہ یہ نہیں ہوا کہ شروع شروع میں لوگ آ گئے ہوں' پھر جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہو' بلکہ مسلسل حاضری بڑھتی چلی گئی۔ اللہ کرے ہمارے واجب الاحترام رجالِ دین کی توجہ اس طرف مبذول ہو جائے اور وہ اس کام کو شروع فرما دیں تو میرے نزدیک یہ بہت مفید کام ہو گا' خاص طور پر جاہلیت قدیمہ کے تمام مشرکانہ اوہام کی جڑیں کاٹ دے گا' شفاعتِ باطلہ کے جو عقائد ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے گا' اوہام کا طومار اِن شاء اللہ تراویح کے ساتھ لفظی ترجمہ کے ذریعہ چھٹتا چلا جائے گا اور توحید خالص نکھر کر اذہان میں جاگزیں ہوتی جائے گی۔

میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہوں' آپ بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو بھی اب تک خیر کی توفیق بخشی ہے وہ اسے شرفِ قبولیت بھی عطا فرمائے اور دوسرے لوگوں کو بھی ہمت دے کہ وہ میرے ساتھ جڑ کر اور میرے دست و بازو بن کر یہ کام کریں

اوراس کے لیےان کے دلوں کوانشراح عطا فرمائے۔ یہ نہیں تو ان کوتوفیق عطا فرمائے کہ وہ صحیح نہج پر دین کا کام کریں۔ یہ صرف میرا کام نہیں ہے' یہ ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی اور سرفرازی کے لیے اپنا تن' من' دھن لگائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے تمام لوگوں کی مساعی کومشکور فرمائے۔ اگر ہمارے دلوں میں خلوص ہوا تو آج نہیں تو کل ہم جمع ہو جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے کسی کے بارے میں اس وقت کوئی اندیشہ ہو' کسی کو میرے بارے میں خدشات ہوں' تو اپنی اپنی جگہ خلوص واخلاص اور خشیتِ الٰہی کے ساتھ کام کریں گے تو ہم یہاں جمع نہ بھی ہو سکے تو دین کی جو بھی صحیح خدمت ہوگی اس کے اثرات اِن شاء اللہ مستقبل میں ایک جگہ جمع ہو جائیں گے— اور آخرت میں تو ہم سب کو بالآخر جمع ہونا ہی ہے: ﴿اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ۝١٥﴾ (الشوریٰ)

اقول قولی هذا واستغفر الله لی ولكم ولسائر المسلمين والمسلمات○○

حواشی وحوالہ جات (اضافہ از مرتبین)

(۱) محترم ڈاکٹر صاحب کے یہ دونوں خطابات ''جہاد بالقرآن اور اُس کے پانچ محاذ'' کے عنوان سے کتابی صورت میں موجود ہیں۔

(۲) محترم ڈاکٹر صاحب کی مشہور تالیف ''علامہ اقبال اور ہم'' میں ایک مستقل باب ''اقبال اور قرآن'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں علامہ نے قرآن حکیم کے بارے میں جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے اس سے متعلق اکثر اردو اور فارسی کے اشعار شامل ہیں۔

(۳) یہ بیان ''تحریک جماعت اسلامی۔ ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے۔

(۴) رواه البيهقی فی شعب الايمان۔ بحواله مشكوٰة المصابيح' كتاب العلم' الفصل الثالث۔

(۵) صحيح مسلم' كتاب الامارة' باب قوله لا تزال طائفة من امتی ظاهرين على الحق......

(۶) دوسرا مصرعہ دراصل شیخ سعدیؒ کا ہے۔

(۷) یہ بزرگ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم تھے۔ افسوس کہ وہ آخر دم تک اسی موقف پر جازم رہے اور اس سے رجوع نہیں کیا۔

(۸) اہل سنت کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک جن چھ کتب احادیث کو صحاح ستہ کہا جاتا ہے ان میں مسلم شریف کا شمار دوسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ حضرت ماعز بن مالک اسلمی رضی اللہ عنہ کے متعلق رجم کے

بعد نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے: لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ اُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ

مصنف عبدالرزاق میں حضرت ماعز اسلمیؓ کے بارے میں حضور ﷺ کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں: اِنَّـهُ الْآنَ لَفِيْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ۔

(۹) ان بزرگ کی تحقیق کا تجزیہ کیجیے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ معاذ اللہ نبی اکرم ﷺ نے موجودہ دور کے تھانہ داروں کی طرح third degree method استعمال کر کے ان صحابی کو اقرارِ جرم پر مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ اس طور پر حاصل شدہ اقرار جرم کی قانوناً کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس طرح واضح ثبوت کے بغیر محض ''تیکھے انداز سے پوچھ گچھ'' کے نتیجہ میں مجبور کر کے اقرارِ جرم کرانے کا الزام معاذ اللہ اس ہستی ﷺ پر عائد ہوتا ہے جو نظام عدل وقسط قائم کرنے کے لیے مبعوث ہوئی تھی: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾۔ مزید برآں ایک نہایت قابل غور بات یہ ہے کہ ان محقق ومفسر قرآن نے متعدد مرتبہ لکھا ہے کہ ''روایات سے معلوم ہوتا ہے''، لیکن کسی ایک روایت کا بھی حوالہ نہیں دیا' جبکہ تحقیق کا حق اور انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ایک صحابی پر جب زبانِ طعن کھولی ہے تو اُن روایات کا حوالہ بھی دیا جاتا تاکہ تحقیق کی جا سکتی کہ ان روایات کا کیا مقام ہے! اکثر معتبر کتب احادیث میں جو روایات ملتی ہیں ان سب کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے بغیر کسی جبر واکراہ کے ازخود اعتراف واقرارِ جرم کیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کو ٹالنا چاہا لیکن وہ مصر رہے کہ ان کو پاک کر دیا جائے۔ حضور ﷺ نے تحقیق فرمائی کہ یہ نشہ تو نہیں کرتے؟ ان پر دیوانگی کا تو دورہ نہیں پڑتا؟ جب ایسی کوئی بات نہیں نکلی کہ ''شک'' کا فائدہ ان صحابی کو پہنچ سکتا تو آپؐ نے ان کے اصرار پر رجم کی حد جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

(۱۰) صحیح مسلم ہی میں غامدیہ خاتونؓ کے بارے میں آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے:
((فَوَ الَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَقَدْ تَابَتْ تَوْبَةً لَوْ تَابَهَا صَاحِبُ مَكْسٍ لَغُفِرَلَهٗ))

(۱۱) واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب ۱۹۸۴ء کا ہے اور جس فتنہ پرور نوجوان کا ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا ہے یہ علامہ جاوید احمد غامدی ہیں' جو اَب اسلام کا ایک جدید روشن خیال' اعتدال پسند ایڈیشن پیش کر چکے ہیں۔

(۱۲) صحيح البخاری' كتاب المناقب' باب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ وصحيح مسلم' كتاب فضائل الصحابة' باب فضل الصحابة ثم الذين يلونهم......

(۱۳) صحيح البخاری' كتاب الاذان' باب الاذان للمسافر......

(۱۴) سنن الترمذی' كتاب فضائل القرآن' باب ما جاء فی فضل القرآن۔

مرکزی **انجمن خُدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

مَنبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ -اور- غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام — نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**